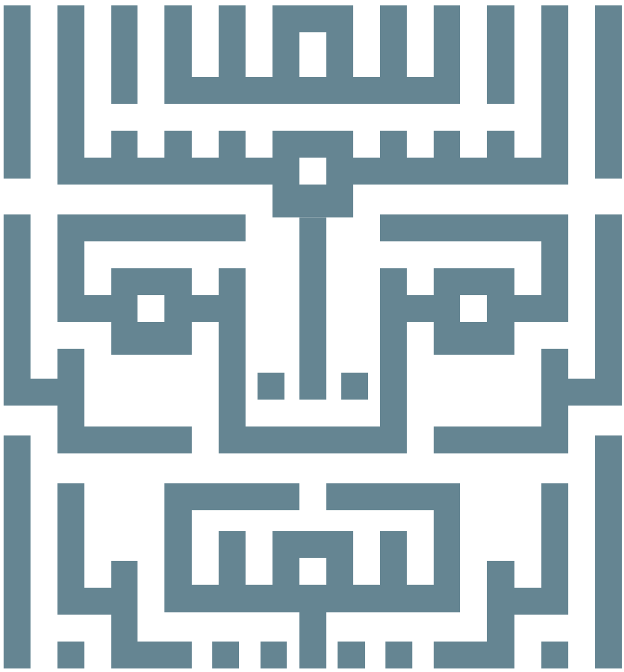
بھید خموشی کا



نوید ظفر کیانی



شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے۔

بھید خموشی کا

مجموعۂ کلام

نوید ظفر کیانی

مکتبۂ ارمغانِ ابتسام

https://archive.org/details/@nzkiani
nzkiani@gmail.com

انتساب

اِس حبس زدہ
سیاسی و سماجی ماحول میں
اعلائے حق کرنے والوں
کے نام

خوشبو کی طرح کھُلنا بھی اچھا نہیں سب پر
اِک بھید خموشی کا بھی اعلان میں رکھنا

مشتری ہوشیار باش

کتاب کا نام	بھید خموشی کا۔
شاعر	نوید ظفر کیانی۔
وضاحت	یہ نوید ظفر کیانی کے کلام کا مجموعہ ہے جسے برقی کتاب کے طور پر شائع کیا جا رہا ہے۔

صفحات	۲۱۳
سالِ اشاعت	دسمبر ۲۰۲۳ء
ہدیہ	دعائیں۔
پبلشر	مکتبۂ ارمغانِ ابتسام۔ اسلام آباد، پاکستان۔

برقی ڈاک	nzkiani@gmail.com
ارکائیو ربط	archive.org/details/@nzkiani

فہرست

حمد

حمد میں کھو گئے ہیں لفظ مرے
سرخرو تو گئے ہیں لفظ مرے

روح میں جو اذان گونجی تھی
سُن کے سب وہ گئے ہیں لفظ مرے

بچھ گئی جانمازِ نطق مری
قبلہ رو ہو گئے ہیں لفظ مرے

اُٹھ گیا ہے قلم حضورِ رب
گفتگو کو گئے ہیں لفظ مرے

لہلہاتے ہیں وصل کے رستے
سجدے کیا ہو گئے ہیں لفظ مرے

ہو گئی ہے رواں ثنا میں زباں
صورتِ لَو گئے ہیں لفظ مرے

آسماں تک گئی دھمک اِس کی
اوک سے جو گئے ہیں لفظ مرے

بندگی بھی ہے آگہی کا سفر
بن کے رہرو گئے ہیں لفظ مرے

اشک برسے ندامتوں کے بہت
دِل و جاں دھو گئے ہیں لفظ مرے

نعت

چاندنی اذکار کی ہو گی شبینے کا لباس
تو یہ پینڈی بھی پہن لے گا مدینے کا لباس

لو لگے اُن ﷺ کی تو پھر دنیا کے رہ پاتے نہیں
کب بھلا تبدیل ہوتا ہے نگینے کا لباس

قیمتی ملبوس میں بھی برہنہ لگتا تھا میں
خاکِ طیبہ نے بنایا ہے قرینے کا لباس

اُس کی جامہ زیبیوں کا تذکرہ صدیوں میں ہے
وہ زمانہ جس نے پہنا ہے مدینے کا لباس

روح اِس آبِ مقدس سے وضو کرنے لگے
جب مدینے کا سفر پہنے پسینے کا لباس

سرمدی ہے زیست آقا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے فدائی کے لئے
مرنے والا پہن کر جاتا ہے جینے کا لباس

کثرتِ اذکار کا احرام باندھے دِل ظفرؔ
اور خوشا ایسا دِل بن جائے سینے کا لباس

اُس بُت کی وفاؤں کو بھی امکان میں رکھنا
کانٹا سا اُٹھا کر کوئی گلدان میں رکھنا

کچھ بھی نہ کیا عشق میں واری نہ اگر جاں
جینے کا افادہ اِسی نقصان میں رکھنا

چھٹتی ہی نہیں ہے تیرے دیوانے کی عادت
کھو دینے کو خود کو تیرے سامان میں رکھنا

کل گھوم کے پھر اِن پہ بھٹکتے نہ پھریں ہم
ہر جادۂ متروک کو اب دھیان میں رکھنا

یوں پوری نہ ہو گی غمِ ہجراں کی ادائی
جو عمر بچی ہے اُسے تاوان میں رکھنا

عادت ہی بنا لی ہے تری یادوں نے اب کے
اِس دِل کو (بھرے گھر کو) بیابان میں رکھنا

دنیا ہے اندھیروں میں مگر سب کو ہوس ہے
ہر روشنی بس اپنے ہی دالان میں رکھنا

پسپا ہوئے سو بار مگر چھوٹا نہیں ہے
اُمید کو ہر حال میں میدان میں رکھنا

خوشبو کی طرح کھُلنا بھی اچھا نہیں سب پر
اِک بھید خموشی کا بھی اعلان میں رکھنا

تلخی ہے وہ خو بو میں کہ خوش آنے لگا ہے
زہراب کو بھی زمرۂ رومان میں رکھنا

ہر پل کی ہو تصویر کشی تیری غزل میں
تاریخ کو اِس ریشمی جزدان میں رکھنا



برف پیڑوں پہ بڑی دیر سے ٹھہری ہوئی ہے
میرے اِس دِل کی گھڑی دیر سے ٹھہری ہوئی ہے

عمر بڑھتی ہی نہیں منطقی رفتار کے ساتھ
کسی لمحے میں پڑی دیر سے ٹھہری ہوئی ہے

اِک تعلق کو شب و روز سے الجھانے کو
وقت کی ٹوٹی کڑی دیر سے ٹھہری ہوئی ہے

پاسِ ناموسِ وفا روکے ہوئے ہے کب سے
یاد پلکوں پہ اَڑی دیر سے ٹھہری ہوئی ہے

جاری و ساری ہے بے خوابی کی غندہ گردی
نیند کھا کھا کے تڑی دیر سے ٹھہری ہوئی ہے

اِسی سرشاری میں تنہا ہی پڑا ہوں بیخود
کوئی سرہانے کھڑی دیر سے ٹھہری ہوئی ہے

اُس کی خوشبو نے مرے خوابوں کو رنگ دینے ہیں
لے کے جادو کی چھڑی دیر سے ٹھہری ہوئی ہے

تشنگی اُس کے مقدر میں نوشتہ ہے ظفرؔ
جس کے آنگن میں جھڑی دیر سے ٹھہری ہوئی ہے





روشن ہے ایک یاد سے چہرہ خیال کا
رحل غزل میں جیسے صحیفہ خیال کا

رہ رہ کے دے رہی تھیں بجھانے کی دھمکیاں
بھڑکا ہے جن ہواؤں میں شعلہ خیال کا

ناراض ہو کے سب سے قلعہ بند ہو نہ جا
اپنی طرف تو کھول دے غرفہ خیال کا

دِل گفتگو کرے گا غزل کی زبان میں
ٹپکے گا لفظ لفظ سے لہجہ خیال کا

بدلے ہوئے ہیں ذائقے سارے پلاٹ کے
ڈالا تھا داستان میں قطرہ خیال کا

کچھ پگڑیوں کے پیچ سے اُلجھا تو خودبخود
انصاف میں بھی آ گیا زمرہ خیال کا

ہر نظریہ ہے اپنی ہی منطق کی اوٹ میں
کیسے ہدف پروئے گا نیزہ خیال کا

بیٹھی تھی گرد جادۂ تاریخ پہ بہت
آویزاں کرنا پڑ گیا کتبہ خیال کا

کتنے مہم جوؤں کو غلط فہمی کھا گئی
لے جائے گا خزانے کو نقشہ خیال کا





رہ گئی خالی مرے دشت کی چھاگل سچ مچ
سر کے اوپر سے گزرتے رہے بادل سچ مچ

چاروں اطراف سے غراہٹیں جھپٹیں مجھ پر
گھر سے نکلا ہی تھا کہ آ گیا جنگل سچ مچ

ہائے بس چل نہ سکا مجھ پہ مرا اپنا بھی
لے گیا باندھ کے مجھ کو کوئی آنچل سچ مچ

اِس قدر شوقِ سفر تھا کہ نہ رک پائے قدم
جان کر بھی کہ ہے جادہ میرا دلدل سچ مچ

ہو گیا ہے کسی آسیب کا سایہ مجھ پر
یا سلگتا ہے کسی جسم کا صندل سچ مچ

آیا، بسرام کیا اور پھر اپنی راہ لی
اُس نے سمجھا تھا مری زیست کو ہوٹل سچ مچ

یوں بھی احساس کے ریشم سے نہ الجھا خود کو
تجھ سے سلجھایا نہیں جائے گا گنجل سچ مچ

عمر کے نام پہ جاری ہوئی محضر اب کے
زندگی کیا کسی لمحے کا ہے مقتل سچ مچ

اب تو اندر کا دباؤ بھی نظر آنے لگا
مسکراہٹ سے ہے چہرہ میرا بوجھل سچ مچ





”مرا کردار مارا جا رہا ہے“
کہانی کا اجارہ جا رہا ہے

وہ جنت کی طرف لے کر چلے ہیں
جہنم سے گزارا جا رہا ہے

ترے جز وقتی جذبے سے الجھ کر
کوئی سارے کا سارا جا رہا ہے

جنوں تھا آسمانوں کا سو ہم کو
خلاؤں میں اُتارا جا رہا ہے

میں موجوں سے نمٹتا رہ گیا ہوں
بھنور لے کر کنارا جا رہا ہے

گزارا جا چکا ہے سر سے پانی
ابھی تک استشارہ جا رہا ہے

اُنہیں برداشت بھی ہونا نہیں ہے
ہمیں جس پر اُبھارا جا رہا ہے

ہمارے دِل کی دھڑکن سا ہے ظالم!
اُسے روکو خدارا! جا رہا ہے!!

ظفرؔ ظلمت کدے سے معرکہ تو
ستارا در ستارا جا رہا ہے





حادثوں نے مانگنا ہے چشمِ بینا کا خراج
کیسے دے پاؤ گے اندوہِ تماشا کا خراج

اب تو ممنوع ہو گیا اپنی طرف بھی لوٹنا
جیسے یہ بے سمتیاں ہوں بختِ رسوا کا خراج

زندگی کو ریزہ ریزہ جا بجا بکھرا دیا
دیتے دیتے کچھ نقوشِ پائے دنیا کا خراج

گھر کی اور دفتر کی پیہم دوڑ۔۔۔محصولِ حیات
عمر کا اندھا سفر۔۔۔سودائے بیجا کا خراج

کتنی آنکھیں خوف سے، حیرت سے پھیلی رہ گئیں
کتنی موجیں لے گئیں ساحل سے دریا کا خراج

میں نے نقشِ پا کیا ہر رشتہ و پیوند کو
مانگتا تھا ہر سفر رنگِ تمنا کا خراج

ہر کوئی دیوارِ وحشت میں ہے چنوایا ہوا
شہر والوں سے نہ لے دیوارِ گریہ کا خراج

ویسے ہی جنتا کبھی اِن کے لہو سے لے نہ لے
جیسے واجب ہے شہنشاہوں پہ جنتا کا خراج

کتنا مقروضِ وفا ہو گا کوئی، سوچو ذرا
جان دے کر بھی جو دے پایا نہ ورثاء کا خراج

اِس کا تو خود اپنا ہی کشکول خالی ہے ظفرؔ
کس لئے امروز کے ذمے ہے فردا کا خراج

اپنے ڈر کو مار دو!!

تیرگی میں خامشی بھی سرسراہٹ سی لگے
اپنے اپنے دل کی دھڑکن ایک آہٹ سی لگے
وسوسوں کے خفتہ شر کو مار دو!
اپنے ڈر کو مار دو!!

جو نہیں ہے کچھ بھی، کیوں کچھ بن کے آئے سامنے
کس لئے ہر پل یونہی دِل کو لگیں ہم تھامنے
وہمِ دل، وہمِ نظر کو مار دو!
اپنے ڈر کو مار دو!!

جو تمھیں دیوار سے جا کر لگائے دمبدم
ہر قدم احساس کو ٹھوکر لگائے دمبدم
ایسے قاتل (پیشہ ور) کو مار دو!
اپنے ڈر کو مار دو!!

زندگی کے راستوں کو اِس نے الجھایا بہت
جو ترے حق میں تھی اُس بازی کو پلٹایا بہت
عمر بھر کے ہمسفر کو مار دو!!
اپنے ڈر کو مار دو!

مضمحل رکھتا ہے یہ ہم آپ کے اعصاب کو
اژدھا بن کر نگل جاتا ہے ہر اِک خواب کو
جانور ہے، جانور کو مار دو!
اپنے ڈر کو مار دو!!

کس لئے مخمور رکھنا خود کو اِس کے زہر سے
جینا ہے تو اب نکلنا ہو گا اِس کے سحر سے
ہر "اگر" کو ہر "مگر" کو مار دو!
اپنے ڈر کو مار دو!!





جبینوں اِک قرینے پہ چلتے ہوئے
ستاروں کے زینے پہ چلتے ہوئے

نکل لیں نہ خوابوں کے لعل و گہر
سنپولے خزینے پہ چلتے ہوئے

ابھی اپنے گردِ سفر میں ہیں گم
زمانے پسینے پہ چلتے ہوئے

کہیں سانپ بن کر نہ ڈسنے لگیں
یہ اوہام سینے پہ چلتے ہوئے

کوئی ہم کو رستہ دکھاتا گیا
کسی اپنے کینے پہ چلتے ہوئے

رہے کیسے آدرش بے رنگ و بو
لہو کے دفینے پہ چلتے ہوئے

سنبھلتی نہیں ہے سنبھالے سے بھی
نظر آبگینے پہ چلتے ہوئے

کسی دن تو چھنکے گی پائل تری
یہ ہفتے مہینے پہ چلتے ہوئے

اُترنا ہے کس پار جا کر ظفرؔ
بھنور کے سفینے پہ چلتے ہوئے





میرا افسانہ بھی کس طرزِ بیاں میں کھو گیا
اِس کا ہر کردار اپنی داستاں میں کھو گیا

ہوش ہی جوشِ سفر میں اب کسے اِس بات کا
کوئی سنگِ میل گردِ کارواں میں کھو گیا

کوئی منزل پا کے اگلی منزلوں کو چل دیا
اور کوئی سنگ میلوں کے نشاں میں کھو گیا

کون سی مشعل مجھے اب راستہ دکھلائے گی
اِک یقین تھا وہ بھی آسیبِ گماں میں کھو گیا

پیاس کی شدت سے ہر پل کی زباں لٹکی رہی
اَبر کا ہر خواب بادِ بے اماں میں کھو گیا

گردشِ دوراں نے دم لینے دیا نہ ایک پل
ہائے جو بھی گھر بنایا وہ مکاں میں کھو گیا

اُس سے اپنی اپنی ترجیحات ظاہر ہو گئیں
اب کہاں تو رہ گیا ہے اور کہاں میں کھو گیا

---ق---
اُس کے لیکھوں میں تھی ایسی ہی کوئی لاحاصلی
اپنی دھرتی سے گرا تو آسماں میں کھو گیا

اِک وہی سورج تھا تیری میری دنیا کا ظفرؔ
ہم سے ٹوٹا تو خلائے بیکراں میں کھو گیا



تجھ میں کا ہے کو ثقل جیسی کشش رہتی ہے
لگتا ہے تیرے بدن میں بھی مری مٹی ہے

چند لمحے تیری معیّت میں گزارے تو کھلا
زندگی کہتے ہیں جس کو وہ فقط اِتنی ہے

میرے چہرے پہ مرا حال عبث پڑھتے ہو
برف کے نیچے کہیں آگ جلے جاتی ہے

کس نے پوچھا ہے مرا حال، یہی دیکھنے کو
مسکراہٹ میرے ہونٹوں پہ امڈ آئی ہے

کیا کروں سالگرہ کی یہ مبارکبادیں
عمر بڑھ جاتی ہے اور زندگی گھٹ جاتی ہے

خواب کی عمر تو بس نیند تلک رہنی تھی
جاگ جانے پہ بھی کیوں اس کا اثر طاری ہے

اب کسی آس کی ڈوری میں بندھے ہیں کیونکر
اب ترے بعد جئے جانے کی ضد کیسی ہے

تیری یادوں کے ستارے رہے تا حدِ نظر
رات نے جب کبھی زنبیل ہنر الٹی ہے

مدتوں بعد قلم دل کی طرح دھڑکا ہے
مدتوں بعد کوئی تجھ پہ غزل لکھی ہے





اِصطلاحِ عشق کی بھی شافی سی تعریف کرنی چاہیے
اپنی بوڑھی خامشی سے کچھ نہ کچھ تخلیف کرنی چاہیے

تیری یادوں سے تری خوشبو کی لپٹیں سی امڈنی چاہئیں
ہجر کے لمحوں کو میرے قلب کی تالیف کرنی چاہیے

کون اپنا سامنا کرتا ہے اِس دنیا میں یوں سچائی سے
آئینے کو عکس میں تھوڑی بہت تحریف کرنی چاہیے

میں تو صدیوں کا سفر طے کر کے بھی آجاؤں گا تیرے لئے
تجھ کو بھی میری طرف دو اک قدم تکلیف کرنی چاہیے

کیسے کیسے چاند تاروں کو جلایا ہے بجھانے کے لئے
آسماں کو ہم زمین والوں کی بھی توصیف کرنی چاہیے

ہم کو ہر اِک سنگِ رہ پر پٹخیاں دیتا رہا ہے عمر بھر
اب تو غرّاتے فشارِ خون میں تخفیف کرنی چاہیے

عدل کی تقسیم کاری پر بھی بھائی مطمئن نہ ہو سکے
چاہتے ہیں، اپنے حصے پر بھی اب تنصیف کرنی چاہیے

کب تلک اِن کے غرورِ اوج کی ہم لاج ہی رکھتے رہیں
ذروں کو تاروں کی آخر تابہ کے تشریف کرنی چاہیے

تھام لینا چاہیے اب غیرتِ ملّی کو بھی خامہ ظفرؔ
یہ مئورخ ہے تو اِس کو زندگی تصنیف کرنی چاہیے





کس لئے خاموش ہو، کھولو زباں، کچھ تو کہو
خامۂ لب سے لکھو پھر داستاں کچھ تو کہو

آخرش اِک روز لگنی ہے عدالت وقت کی
کام آئے گا تمھارا بھی بیاں کچھ تو کہو

دھول کا طوفان تھا اور راستوں کے چیستاں
اِس سفر کو کھینچتا رہرو کہاں کچھ تو کہو

برہنگی تہذیبِ گلشن ہو گئی ہے اِن دنوں
یا لباسِ فصلِ گل میں ہے خزاں کچھ تو کہو

ظلمتیں پروانۂ رہداری کیوں جاری کریں
جب ستاروں سے سجی ہے کہکشاں کچھ تو کہو

تیری آوازوں کی ٹاپیں اِس تواتر سے پڑیں
دھڑکنیں راہوں میں بھر دے کارواں کچھ تو کہو

بے حسی کے خاروخس میں کوئی تو شعلہ گرے
چھوڑ جاؤ تم بھی تو اپنا نشاں کچھ تو کہو

پھوٹ پڑنے کو ہمکتا تو ہے چشمۂ صدا
اِک جھماکے سے اڑے سنگِ گماں کچھ تو کہو

وقت کے تالاب میں اک ایسا پتھر پھینک دو
گونج اٹھے یہ زمین و آسماں کچھ تو کہو

کب تلک وحشی رہیں گے درد کی زنجیر میں
تم سکوتِ ہجر کے ہو راز داں کچھ تو کہو

زندگانی سے زیادہ عمر ہو گی عشق کی
لیک پہلا سانس تو لو، جانِ جاں، کچھ تو کہو

چپکے چپکے کچھ چراغوں کو بجھایا تو گیا
دور تک پھیلا ہوا تو ہے دھواں کچھ تو کہو

بادباں کھولے تھے موسم کے اشارے پر ظفرؔ
کیوں بھنور میں ہیں ہماری کشتیاں کچھ تو کہو



چیخ

وہ جنھیں حالات نے
کر دیا ہے بے زباں
اُن کی چپ کی داستاں
چیخ کی صورت سنو



عکس کو بھی زعم کیا کیا آئینہ ہونے کا تھا
بخت دنیا کی کثافت میں مگر کھونے کا تھا

کچھ تو طشتِ زخم سر پہ دھر کے آئی تھی بہار
کچھ مری آنکھوں کو بھی لپکا لہو رونے کا تھا

وقت کی تابش میں سارا ہی ملمّع بہہ گیا
وہ کہاں تھا اُس پہ تو پانی فقط سونے کا تھا

یہ معمّہ ظرف کا کوئی سمجھ پایا نہیں
داستاں تھی دیو کی، کرداریوں بونے کا تھا

رنگ و خوشبو کی طرح جب مل گئے تو مل گئے
میں کہاں کا اور تو دنیا کے کس کونے کا تھا

ہاتھ چھوٹا، ساتھ چھوٹا زندگی کا اور بس
تیرا میرا مسئلہ پھر عمر ہی ڈھونے کا تھا

کام ذمے لے لیا بے مائیگی کے باوجود
شبکدے میں نور کے منظر نئے بونے کا تھا

نارسائی نے تو ہم میں بھر دیا تھا اِک جنوں
اپنی آنکھوں سے تمہارے خواب ہی دھونے کا تھا

وقت نے تنگنا کے دامانِ تہی اُلٹا دیا
ایک مدت سے سبھی کو خوف کچھ ہونے کا تھا

کس کا استحصال کھاتے میں لکھا ہے آپ کے
پورا ساغر لے گئے ہیں، حوصلہ پونے کا تھا

کجکلاہوں نے زمیں میں آگ ہی بھر دی ظفرؔ
خاک زادوں کا ارادہ آسماں بونے کا تھا



دِن بھر اِس کی رونق دیکھنے والی تھی
شب کو جیسے ساری بستی خالی تھی

رفتہ رفتہ بھر جائے گا زخمِ دِل
مجھ کو اُس کے جیسی خام خیالی تھی

جس پر آپ مچان بنانے والے تھے
جانے اژدر تھا یا پیڑ کی ڈالی تھی

سائے بھی گھمبیر تھے چاند ستاروں کے
توبہ اب کے رات بھی کتنی کالی تھی

ڈھونڈ رہے ہیں یوں ثمرات محبت کے
جیسے ہم نے کوئی کمیٹی ڈالی تھی

رنگ و بو تو ظرف کے مظہر تھے کیانی
فصلِ گل تو آنکھوں کی ہریالی تھی



وقت کے ردی دان میں ہم نے ڈالی ہے
وہ رت بھی جواب کے سبز ماآلی ہے

جیون کے احوال نہ پوچھو فرقت میں
کیسے تیرے بعد یہ مینا پالی ہے

بارِ رخصت سہہ نہ سکے گا یہ فدوی
عرضی نامنظور جنابِ عالی ہے

صدیوں سے وہ رنگ و روپ ہے نظروں میں
یار قیامت میری دیکھی بھالی ہے

اپنی جانب لے جاتا ہے ہر رستہ
ظالم نے ہر بات سے بات نکالی ہے

ایک صدا جو بن سکتی تھی ہم سب کی
تیز ہوا کے شور میں ڈوبنے والی ہے

اہلِ چمن کا چہرہ دیکھو اور سوچو
تیرے رخ پر کس کے خون کی لالی ہے

رنگ و بو کے چھینٹے ہیں یا غزلیں ہیں
غزلیں ہیں یا لفظوں کی دیوالی ہے





میں یاروں میں کیا اپنا قصہ نکالوں!
پرانی خبر کا ضمیمہ نکالوں؟

تماشہ بنوں گا، تماشا کروں گا
گلی کی طرف اِک دریچہ نکالوں

میں پھر بھی ہوں سارے کا سارا تمہارا
اگر خود میں سے اپنا حصہ نکالوں

اِسی رنگ و بو سے زمانے کو جیتوں
لہو میں گھلوں یا پسینہ نکالوں

اَٹے جاؤں اوروں کی گردِ سفر میں
یا میں آپ گنجل سے رستہ نکالوں

اِسی میں ہے فردا کا سارا ہی نقشہ
نقوشِ کفِ پائے رفتہ نکالوں

ملوں تن بدن پر میں خاک اِس زمیں کی
ترے آسمانوں سے رشتہ نکالوں

یہ مجبوری کوئی بہانہ نہیں ہے
بچھڑنے کا کوئی طریقہ نکالوں؟

جو گرداب میرے لہو میں بنا ہے
ظفرؔ اُس سے کیسے سفینہ نکالوں





بستیوں پہ اب تو غرّانے لگا دریائے سرخ
ملگجے پانی کے بھی ہونے لگے پیرائے سرخ

کتنے قریوں میں گئے بادل نمو کی رت لئے
جب مری تقدیر میں آئے تو بن کر آئے سرخ

ہجر کی پت جھڑ بھی ملتی ہے اُسی سے کل کلاں
آج بُکّے میں کسی نے پھول تو بھجوائے سرخ

میرے لہجے میں فشارِ خون بھی اس نے بھرا
میری باتیں سن کے جس کا چہرہ ہوتا جائے سرخ

ہم تہی دستوں کے ساغر بھی کبھی گلگوں کرے
رقص کرتی پھر رہی ہے ہر طرف مینائے سرخ

ٹہنیوں کے ہاتھ میں کیوں زرد پتّوں کے علم
سبز موسم پر لگے تھے کس قدر سرمائے سرخ

روشنی کی منتظر نظروں کو کب معلوم تھا
ایسے چکا چوند ہو گا دیدۂ بینائے سرخ

وہ کہ جس کے نام کا مالک بھی کوئی اور ہے
اُس کے دامن پر نچھاور میرے سب گلہائے سرخ

ڈوبتا ہے کوئی سورج یا نکلتا ہے ظفرؔ
اِک معمّے نے افق کو پیرہن پہنائے سرخ





کس رعونت سے چل رہا ہو گا
کوئی خود کو کچل رہا ہو گا

کیسے اُٹھ آئے آپ جرگے سے
مسئلہ زیرِ حل رہا ہو گا

دِل تری یاد کے بہاؤ میں تھا
آنسوؤں میں اُبل رہا ہو گا

جس سمے کو ابد سمجھتا ہوں
وہ بنائے ازل رہا ہو گا

آج جو نہ ہوا ، وہ کل کو بھی
آج کل، آج کل رہا ہو گا

کوئی اُس کی جگہ بھی لے لے گا
یوں تو وہ بے بدل رہا ہو گا

جس نے سچ بولنے کی ٹھانی تھی
وہ بھی کیا بے محل رہا ہو گا

کر گیا زندگی بدر مجھ کو
کیسے جانِ غزل رہا ہو گا

خود کو کتنا بدل سکا ہے ظفرؔ
جو کلینڈر بدل رہا ہو گا





خوشبو مرا پیام ہو، لوگوں کو سُکھ ملے
محوِ صبا خرام ہو، لوگوں کو سُکھ ملے

بے رنگ منظروں پر برش پھیر دوں ہرا
خوابوں کا احترام ہو، لوگوں کو سُکھ ملے

ذوقِ سفر کی آگ دِلوں میں لگی رہے
اور چھاؤں گام گام ہو، لوگوں کو سُکھ ملے

جو ہر نظر میں نورفشاں ہو کرن کرن
وہ چاند بام بام ہو، لوگوں کو سُکھ ملے

ہر ذات میں حیات کے ساغر بھرے رہیں
ساقی ہو، دورِ جام ہو، لوگوں کو سُکھ ملے

ہم کو کسی ازم سے کوئی دشمنی نہیں
بس خیر کا نظام ہو، لوگوں کو سُکھ ملے

اِک زر نہیں ہے آپ کی خدمات کا صلہ
بہرِ دعا بھی کام ہو، لوگوں کو سُکھ ملے

پھوٹے کسی زمین پہ چشمہ ثبات کا
ہر تشنہ لب کے نام ہو، لوگوں کو سُکھ ملے

عمرِ رواں سے اِتنی تو فرصت ملے ہمیں
جینے کا اہتمام ہو، لوگوں کو سُکھ ملے

اِک دوسرے کے واسطے بن جائیں روشنی
ہر شب یہ اہتمام ہو، لوگوں کو سُکھ ملے

ہوں گے نہ بے مزہ کبھی نشتر زنی پہ بھی
مقصد جو التیام ہو، لوگوں کو سُکھ ملے

تہذیب کی بہار سے عالم ہو گل کدہ
ہر شخص خوش کلام ہو، لوگوں کو سُکھ ملے



کاغذ

ہمارے ذوقِ علم و آگہی کا نور ہے کاغذ
مکان و لامکان کے رنگ سے بھرپور ہے کاغذ
کہ اپنی خوشبوؤں سے آپ ہی مخمور ہے کاغذ

چلائے ہیں تفکر نے بڑے لفظوں کے ہل اس پر
بنایا ہے کتابت نے نمو کا ایک چھومنتر
کھڑا ہے جابجا سبزہ، سراپا بور ہے کاغذ

کہانی ہی کہانی ہے، فسانے ہی فسانے ہیں
نہ جانے کتنی ہی نسلوں نے سننے اور سنانے ہیں
بڑی یلغار ہے، ہر سمت سے محصور ہے کاغذ

یہ میرا دور کیا ہے، میرے جد واب کا البم ہے
کتابِ عمر ہے برسوں کے روز و شب کا البم ہے
بہت بارِ فسانہ ہے، تھکن سے چور ہے کاغذ

ہمارے ذوق سے ہی دیکھ لیجے پوچھ کر قیمت
اِسی کو جھانکتا ہے آتے جاتے دیدۂ حسرت
پسِ شوکیس ہنستا ہے، بڑا مغرور ہے کاغذ

کچھ ایسا ہو گیا اِس سے لگاؤ اپنا جذباتی
ہزاروں بار چھو کر بھی ہوس دل کی نہیں جاتی
نقوشِ شوق ہیں آنکھیں، نشانِ طور ہے کاغذ

خرد نے اب سپردِ بادِ حرف وصوت کر ڈالا
اجارہ اِس کا جس پر تھا، فضا کو اُس سے بھر ڈالا
نہ جانے کب تلک انسان کا مقدور ہے کاغذ





ایک قصے کا دونوں حصہ ہیں، میں تو کب سے کھڑا ہوا ہوں یہاں، تو کہاں ہے، سوال تو یہ ہے
جس میں لیتے ہیں سانس میں اور تُو تیری میری نہیں تو پھر کس کی داستاں ہے، سوال تو یہ ہے

کل یہی خطہ تھا کہ جس میں ہم لوگ اپنی زمیں کے مالک تھے، آپ اپنے یقیں کے سالک تھے
اب تو کھلتا نہیں ہے یہ عقدہ، جانے اپنے سروں پہ کس کس کا آسماں ہے، سوال تو یہ ہے

بے نفس جسم ڈھہ بھی جائے تو، فکر ہوتی نہیں ہے لوگوں کو، اس کا غم کم ہی ہوتا ہے یارو!
وہ شجر کٹ گیا تو کیا ہوگا، جس شجر پر کسی پرندے کا آشیاں ہے، سوال تو یہ ہے

ہائے کیسی ہے ارتقا کی ہوس، کس دھندلکے میں کھو گئے ہیں ہم، بانجھ کیوں اِتنے ہو گئے ہیں ہم
سرِ بازارِ ضو ہوا کیا ہے، بند تہذیب کی تمدن کی، ہر دکاں ہے، سوال تو یہ ہے

عمر گزری ہے اِس جنوں میں مری، اُون کی طرح اُس کے خوابوں میں، خود کو بُنتا رہوں، اُلجھتا رہوں!
جس کو تم رائیگاں سمجھتے ہو یا جو دنیا بتائے جاتی ہے، رائیگاں ہے؟ سوال تو یہ ہے

فکر اِس باب میں مزید کریں، کون سے نکتے کو کلید کریں، کس کو کس بات سے کشید کریں
قحطِ ابلاغ کے زمانے میں جو بہت بولتا ہے وہ کتنا بے زباں ہے، سوال تو یہ ہے

ماندہ پائی کا ہے گلہ لیکن کارزارِ حیات میں میرا چلنا پھرنا بنائیں تو ممکن
کہیں لاوا ہے اور کہیں سیلاب، پاؤں دھرنے کو اِس زمیں پہ کہیں پائیداں ہے؟ سوال تو یہ ہے

کل یہیں قافلے میں سب شامل چل رہے تھے مگر تھے بے منزل، وقت کی رہزنی سے تھے گھائل
اب اِسی رہگذار پر کیسے اِک مسافر کہ تنہا ہو کر بھی کارواں ہے، سوال تو یہ ہے

مجھ کو تسلیم میرے نکتہ چیں، اُس کے لہجے میں آگہی کی کوئی ایک ہلکی سی بھی لکیر نہیں
پھر بھی میں پوچھتا ہوں ایسے میں، جس کو میں کہہ رہا ہوں اپنا نشاں، بے نشاں ہے؟ سوال تو یہ ہے

بحث کرتے ہو یونہی چارہ گر! تیرے چارہ گری کے دعوؤں پر، مجھ کو ہرگز تحفظات نہیں
پہلے یہ بات جان لینی تھی، تیرے کیانی کو تیرے بسمل کو، غمِ جاں ہے؟ سوال تو یہ ہے



دھوپ کے مقتل تلک کھینچی گئی چھاؤں کی حد
دیکھئے لے کر کہاں بیٹھے شناساؤں کی حد

دیکھنے والوں سے کب پنہاں ہیں ان دیکھے افق
یوں تو تا حدِ نظر ہوتی ہے بیناؤں کی حد

دِل ملیں تو سینکڑوں کوسوں کی دوری کچھ نہیں
میرے گھر سے آ لگی جیسے مرے گاؤں کی حد

جب دعا کے ہاتھ تھامے ہیں تو کاہے فکر ہو
دیکھتی ہے کب مکان و لامکاں ماؤں کی حد

ساری دنیا مل ملا کر بھی بنا پائی نہیں
حسنِ بے حد کے لئے میری تمناؤں کی حد

جذبہ دل کی اُڑانیں آسماں در آسماں
کون کر سکتا ہے طے جانباز سیناؤں کی حد

یوں تو جب چاہا سروں پر سے گزر جائیں گے یہ
اب مقرر کرنا ہوگی کوئی دریاؤں کی حد

لے کے اُڑ جائے گی صوت و لے کی مقناطیسیت
شورشوں میں گم نہ ہو جو نغمہ پیراؤں کی حد

اِس قدر ویرانیاں مجھ میں بھریں کس نے ظفرؔ
کیوں مری دہلیز کو چھوتی ہے صحراؤں کی حد





ابھی سستا ہے کوئی
سو وابستہ ہے کوئی

جو دِل اُجڑا ہوا ہے
وہاں بستا ہے کوئی

بہت غم دِل میں ہوں گے
بہت ہنستا ہے کوئی

جگر تھامے ہوئے ہوں
کہ پیوستہ ہے کوئی

یہ اِک طرزِ فغاں ہے
یا لب بستہ ہے کوئی

تری یادوں میں چھپ کر
مجھے ڈستا ہے کوئی

دعائے باراں والو!
مکاں خستہ ہے کوئی

مسافت ہے دروں کی
کمر بستہ ہے کوئی

کہیں اندھا خلا ہے
کہیں دھنستا ہے کوئی

جہاں سب رک گئے ہیں
وہیں رستہ ہے کوئی

یوں خاروں خار ہے وہ
کہ گلدستہ ہے کوئی

میں چپ پاسِ وفا میں
سو برجستہ ہے کوئی

طنابیں مجھ میں کس کی
ظفرؔ کستا ہے کوئی





جفا ترغیب دے پہلے سے بھی دونی، ارے توبہ
نکل آئے گھروں سے ساری کالونی، ارے توبہ

تمہاری یاد سے کرتی رہی ہے رات بھر باتیں
ہماری خامشی ہے کتنی باتونی، ارے توبہ

کسی کے عشق میں پوری طرح گوندھا گیا ہوں میں
بدن کی خاک میں مٹی یہ بیرونی، ارے توبہ

یہ اپنی آئی پر آئے تو کب مانے خدا کی بھی
مسلماں جسم میں اِک دِل ہے صیہونی، ارے توبہ

پئے اہلِ دلاں تو ہے ہمیشہ سے ہی مستحسن
شعورِ عشق میں ہر فعل مجنونی، ارے توبہ

اُلجھتا جاتا ہے کتنے ہی خاروں خار رشتوں سے
اُدھڑتا جاتا ہے بندہ کوئی اُونی، ارے توبہ

مکاں کے مسئلوں سے سرخرو ہونا نہیں آیا
نصابِ لامکاں کو سمجھیں مضمونی، ارے توبہ

نظر آئے بہر سو چلتے پھرتے المیے مجھ کو
جہاں تک جا سکی میری نظر سُونی، ارے توبہ

غزل بن کر جہاں بھر میں اداسی کی نمی بھر دی
ہوئی ماتم کناں یوں چوٹ اندرونی، ارے توبہ

یہ خودکش حملہ آور کی طرح ٹکرائے دنیا سے
ظفرؔ سودائے سر ہے کس قدر خونی، ارے توبہ

کیسے دنیا نے پا لیا زندہ
اِتنا زندہ کہ میں لگا زندہ

زندگی کی پکار سنتا رہا
میں بدن میں پڑا ہوا زندہ

ٹھیک ہے رفتگاں کا غم لیکن
یار میں بھی تو کب رہا زندہ

منجمد منظروں کو بھی اب کے
کر گیا ایک شعلہ پا زندہ

وقت یوں بھی نہ دفن کر پایا
ہر کوئی تھا ذرا ذرا زندہ

تاش کے سب محل ہوں خاکستر
ہو جائے شعلۂ نوا زندہ

غیرتِ عشق کی حرارت سے
سر سلامت ہے تو قبا زندہ

دِل دھڑکتے تھے مردہ جسموں میں
بے نفس تھے مگر خدا زندہ

عمر کی شورشیں تھیں اُس میں بہت
میں بھی تھا کچھ برا بھلا زندہ

ہر کوئی ہے عدم کے رستے پر
زندگی سے لدا پھندا زندہ

ساری دنیا کریدتی ہی رہی
کیا خبر کیسا نی تھا نہ تھا زندہ

مجبوری

زہرِ ہجرت کا کھا کر بھی جینا پڑا
ہجر کی موت پا کر بھی جینا پڑا
دِل لہو تھا مگر بہرِ دنیا مجھے
مسکرا مسکرا کر بھی جینا پڑا

جانے

یہ جیون ہے یا کوئی امتحاں ہے
ہر اِک لمحہ لگا ہے آزمانے
کہاں لے آیا ہے ہم کو زمانہ
کہاں لے جائے ہم کو وقت جانے



راستے کٹتے نہیں تھے، امتحاں ایسا تھا کچھ
راہرو رکتے نہیں تھے، کارواں ایسا تھا کچھ

جو کہانی میں تھا اندوہِ جہاں کھُلتا نہ تھا
کیا کریں کہ بہرِ زیبِ داستاں ایسا تھا کچھ

اُس کی چُپ نے سب دلیلوں کو دکھایا آئینہ
کوئی کچھ نہ کہہ سکا، وہ بے زباں ایسا تھا کچھ

میں کسی کا ہو نہیں پایا تھا خود اپنے سمیت
اِس جہاں اور اُس جہاں کے درمیاں ایسا تھا کچھ

مجھ پہ فردِ جرم اپنے قتل کی لگنی ہی تھی
عدل کیا ہوتا کہ قاتل کا بیاں ایسا تھا کچھ

میں زمیں پر خود کو اکثر بے اماں لگنے لگا
جو مرے سر پر رہا وہ آسماں ایسا تھا کچھ

جانتے تھے اِس میں ہے جی کا لہو، جاں کا زیاں
پھر بھی ہر کوئی گیا، شہرِ بُتاں ایسا تھا کچھ

سحر کب تھا، وہ تو تھی اپنے لہو کی موج سی
لوگ کہنے کو تو کہتے ہیں، وہاں ایسا تھا کچھ

لوگ سب پتھر تھے لیکن گوش بر آواز تھے
داستاں مکتی نہ تھی، معجز بیاں ایسا تھا کچھ

شاعری سے اُٹھ نہ پاتا جذبِ دل کا بوجھ بھی
شعر کھو جاتے تھے، لفظوں کا دھواں ایسا تھا کچھ



تعمیر پر پڑیں گے جہاں بھی ہنر کے شیڈ
بھر دیں گے اِس جہاں کو جہانِ دگر کے شیڈ

یہ چاند یہ ستارے ہیں اصواتِ نظریات
ظلمت کے کینوس پر ہیں گویا سحر کے شیڈ

مجھ میں مذاقِ نالہ و شیون نہ تھا مگر
اِک خامشی تھی، جس میں رہے شور و شر کے شیڈ

یونہی نہیں بہر سو دھنک سی کھلی ہوئی
پڑتے ہیں اُن کے جلوؤں پہ میری نظر کے شیڈ

موسیقی چیچہوں کی اُنہیں کا نصیب ہے
جن آنگنوں میں رقص کناں ہیں شجر کے شیڈ

میں خواب تو نچوڑلوں ہر اِک سراب سے
لیکن اِدھر اُدھر ہیں نہ جانے کدھر کے شیڈ

تا دیر اپنا عکس بھی پہنا نہیں گیا
مجھ میں جمے ہوں جیسے ابھی تک سفر کے شیڈ

میں کھو کے رہ گیا تھا گماں کے ہجوم میں
کچھ آگہی کے رنگ تھے اور کچھ خبر کے شیڈ

اشکوں کا لاوا ہو گیا بے اختیار سا
انگنائیوں میں آ گئے دیوار و در کے شیڈ

ڈسنے لگے گی پل پل جبیں کی شکن شکن
دیکھے وہ اپنے پیکر میں بھر کر ظفرؔ کے شیڈ



اکثر ایسا ہول اُٹھے
سارا سمندر بول اُٹھے

چپ کی شرم نہ رکھی جائے
تو دِل خود ہی کھول اُٹھے

وحشت کا وہ درجہ ہے
آپ ہی بج کر ڈھول اُٹھے

رہرو منزل کی خاطر
ہر رستہ رول اُٹھے

چشمِ خرد میں ڈورے پڑیں
نشّہ انمول اُٹھے

ضد کی سبک خرامی پر
سب سڑکوں پر ڈول اُٹھے

تبدیلی آجائے گی
جب سارا ماحول اُٹھے

کیسی جلوہ کشائی ہے
خول کے اندر خول اُٹھے





بے سمتی رہی عالمِ مغرور کا ماخذ
نظّارہ ملا دیدۂ بے نور کا ماخذ

تصویر بنائی نہیں جا سکتی دکھوں کی
چہرہ نہیں ہوتا دلِ رنجور کا ماخذ

پھر سے ہے کسی دیکھنے والے کی چنوتی
پھر سے وہی جلوہ ہے (کسی طور کا ماخذ)

اب عمر کے نقشے میں کوئی رنگ بھریں کیا
جیون ہے کسی ساعتِ بھرپور کا ماخذ

فرقت میں ترا ملنا بھی اِک خواب ہے گویا
نزدیک سے لگتا ہے بہت دور کا ماخذ

تو کس کی تمناؤں کو دفنایا ہے کس میں
یہ مٹی رہی ہے ترے مزدور کا ماخذ

ہر گام پہ رہ رہ کے زباں گیر رہا ہے
خود اپنے ہی لکھے ہوئے منشور کا ماخذ

سرمائے نے کیوں باگ پکڑ لی ہے وطن کی
یوں تو یہ خرابہ نہیں دستور کا ماخذ

مُدت سے ہے گم گشتہ کسی خواب میں کیانی
ڈھونڈے سے بھی ملتا نہیں مفرور کا ماخذ





ہم ہوس زادوں کو سوغاتِ وفا کیا دیتے
جسم کی بھوک میں روحوں کی غذا کیا دیتے

اپنے ہر خواب کو تعبیرِ نشیمن بخشی
شاخ در شاخ پرندوں میں اُڑا کیا دیتے

ہمہ تن گوش تھا بازارِ زمانہ میں عبث
اِس قدر شور میں دیتے تو صدا کیا دیتے

اپنے ماحول کی ظلمت کو چھپاتے کیسے
حبس کا ذکر تھا، تمہیدِ صبا کیا دیتے

خیر اندیشوں کی مجبوری سمجھ سکتا ہوں
میرے حالات سمجھتے تو دعا کیا دیتے

پھول کو تتلی بنانے کا ہنر جانتے ہیں
اِک ذرا سوچئے ہم تم کو بنا کیا دیتے

وہ جو پت جھڑ میں بھی دیوارِ چمن پر لکھے
کسی موسم میں اُسے درسِ فنا کیا دیتے

چپ کی دیوار پہ ٹانکی تو ہوئی ہیں چیخیں
اور تاوانِ خودی لوگ بھلا کیا دیتے

بے وفائی کے حوالے سے رہے یاد ظفرؔ
بھولنے والوں کو ہم لوگ بھُلا کیا دیتے





ملے وہ عمر ہمیں کہ بہاریں ہم جس کو
گزرتے ہی نہیں وہ پل، گزاریں ہم جس کو

پھر اپنی ذات کے گرداب میں نہ کھو جائے
کنارے پر کبھی لا کر اُتاریں ہم جس کو

بنا رہے گا حوالہ ہمارا گلشن میں
وہ برگِ گل کہ لہو سے نکھاریں ہم جس کو

ہم اپنے آپ سے نکلے ہیں سرخرو ہو کر
یہ جیت ایسی نہیں ہے کہ ہاریں ہم جس کو

ہم اپنے آپ کو خود سے ادھیڑتے ہیں عبث
وہ دھیان سے نہیں جاتا، بساریں ہم جس کو

وہ اگلے روز کا سورج ہے، پھر سے نکلے گا
کہ مر کے بھی نہیں مرتا ہے، ماریں ہم جس کو

مٹا سکا نہ کبھی درمیاں کے کالے کوس
وہ چاند بھی، تیری صورت پہ واریں ہم جس کو

اُسے ڈراتی نہیں زندگی کی طغیانی
ڈبوئیں اور ڈبو کر اُبھاریں ہم جس کو

عجیب جبر کے عالم میں روز و شب ہیں ظفرؔ
مگر وہ گیسوئے ہستی، سنواریں ہم جس کو





عمر کو جینے کی حسرت میں دیکھ لیا
اپنی مٹی کی قیمت میں دیکھ لیا

راہ دِکھی بس ایک حوالے کی لو میں
ہر اک چاند کو ہر ظلمت میں دیکھ لیا

عشق میں ہر ہر طور کی دھوپ اور چھاؤں تھی
ہم نے کیا کیا اِس مدت میں دیکھ لیا

عکس سے ایسے ایسے پہلو اخذ ہوئے
آئینے کو بھی حیرت میں دیکھ لیا

کن نظروں سے دیکھ رہا ہوں میں سب کو
کس صورت کو ہر صورت میں دیکھ لیا

مانا اُس نے کیا نہیں اقرارِ وفا
اُس کی چپ کو اِس لذت میں دیکھ لیا

تیرے جلوؤں کے باغات میں پہنچی نظر
اپنی دوزخ کو جنت میں دیکھ لیا

تیرا میرا پیار افق سا دھوکہ تھا
ارض و سماء جیسی قربت میں دیکھ لیا

ہم نے تمنا کا بھی بیوہ کرب ظفرؔ
تیری ہجراں کی عِدت میں دیکھ لیا





ذات کی حد سے تو بڑھتے ہی نہیں
ہم کسی زینے پہ چڑھتے ہی نہیں

رنگ پھولوں میں بہت ہیں لیکن
دیکھنے والوں پہ پڑتے ہی نہیں

حاجتِ ناصح دِلوں کو کیا ہو
یہ سنورنے کو بگڑتے ہی نہیں

وہ اگر پھول سے ہیں تو ہوں گے
پھول باتوں سے تو جھڑتے ہی نہیں

ہاتھ خوشبو کا پکڑ رکھا ہے
راستے میں کہیں اَڑتے ہی نہیں

اُڑ گئے سارے دِلوں کے پنچھی
پیڑ تو ایسے اجڑتے ہی نہیں

ہم کسی اور کا کتبہ ٹھہرے
اپنے مرقد پہ تو گڑتے ہی نہیں

ہجر کی آنچ بہت دھیمی ہے
راکھ ہو جاتے ہیں، سڑتے ہی نہیں

اعتماد اپنے دیے پر ہے بہت
ہم ہواؤں سے جھگڑتے ہی نہیں

رِزق بن جاتے ہیں شورش کا ظفرؔ
لوگ حالات کو پڑھتے ہی نہیں



اِس قدر تلخی لہو میں گھول دو
ساری دنیا کو سبو میں گھول دو

اِک نہ اِک توشہ ہے ہر اِک ہاتھ میں
سارے موسم رنگ و بو میں گھول دو

یا مجھے جمنے دو ظرفِ ذات میں
یا ہوائے چار سو میں گھول دو

کہکشاں اِک یاد کی دِل میں بچھے
چاند کو اِس آبجو میں گھول دو

یہ سیاہ روغن بنے جزوِ دھنک
حسرتِ دِل آرزو میں گھول دو

بھاری پڑ سکتی ہے اپنی ہی اُٹھان
زہر بھی تھوڑا نمو میں گھول دو

حرصِ دنیا روکشِ تیزاب ہے
یوں نہ خود کو کاخ و کو میں گھول دو

معتبر نسبت کرے گی معتبر
اپنا سب کچھ اللہ ہو میں گھول دو



جزیہ

(ایک ریوو)

رات کے طاق پہ اِک چاند دھرا بھی ہے تو کیا
ساعتِ عصر کا عنوان اندھیرا ہے ابھی
چند کرنوں سے اگر خواب بھرا بھی ہے تو کیا

وقت اک سیلِ رواں کی طرح بہتا ہوا ہے
کب سے بے سمت پھرے ڈل میں شکارا کوئی
یہ یقین اب بھی گماں کی طرح بہتا ہوا ہے

روشنی جیسے حکایات کا حصہ ہی نہ ہو
گنگنائے چلا جاتا ہوں میں جس دھن میں غزل
اِس کا آہنگ مری ذات کا قصہ ہی نہ ہو

پھر بھی آئی ہے مرے سامنے شمعِ محفل
کھول دے گیتوں کے منہ، بانٹ دے سارے جذبے
روشنی مانگتی ہے تجھ سے بھی جزیہ اے دل





عمروں کا موم ڈھل گیا پل بھر کی دھوپ میں
میں یک بیک پگھل گیا، منظر کی دھوپ میں

کتنے ہی برشگال بلاتے رہے مجھے
اور میں جھلس کے رہ گیا اندر کی دھوپ میں

ٹھٹھرے ہوئے وجود سے باہر نکل گئی
بیٹھی رہی تمنا دسمبر کی دھوپ میں

ہر مہربان پیڑ نے چھاؤں سمیٹ لی
اگلا سفر ہے گویا مقدر کی دھوپ میں

آیا تھا ایک زمرۂ دیگر میں شہرِ دل
مضطر ہوں ایک اور ہی محور کی دھوپ میں

درپیش معرکہ ہے مجھے اپنی ذات کا
سایہ کھڑا ہوا ہے برابر کی دھوپ میں

کرسی پہ بیٹھے بیٹھے سفر کر لیا تمام
میں چُرمرا کے رہ گیا دفتر کی دھوپ میں

رن پڑ گیا ہے جذبۂ بے اختیار سے
خورشید بے نیام ہے تیور کی دھوپ میں

دشتِ وفا سے کس لئے جاتا نہیں ظفرؔ
کب تک رہے گا اِک غمِ خودسر کی دھوپ میں





ایک مدت سے چارسو ہے وہی
غیر مانوسیت کی خو ہے وہی

فرو ہے میرا ہی نشہ شاید
وقت کے ہاتھ میں سبو ہے وہی

اِک تغیر پہ دل جمعی سی ہے کچھ
ہم وہی، فکرِ کاخ وکو ہے وہی

اپنے اپنے ضرورت میں ہی سہی
اب تلک میں وہی ہوں، تو ہے وہی

ظرف بیکار الجھے موسم سے
دیکھ! گلشن میں رنگ و بو ہے وہی

دِل و جاں ہیں اُسی کے کوچے میں
یوں تو کہنے کو کرفیو ہے وہی

خشک پتوں میں بود و باش پہ بھی
بعضوں کی خواہش نمو ہے وہی

اِس لئے احتیاط لازم ہے
جو ترا یار تھا، عدو ہے وہی

اُس کی باتوں پہ جو کہا تھا ظفرؔ
اُس کی چپ سے بھی گفتگو ہے وہی





ہوا کھائی ہے میں نے ماسوا کی
کھلی رکھنا کوئی کھڑکی خلا کی

گلے آ کر لگا احساس اُس کا
ابھی آئی نہ تھی خوشبو صدا کی

میں مر جاؤں گا اپنی زد میں آ کر
چٹانیں مجھ پہ گرنی ہیں انا کی

کوئی حیرت لئے پھرتی ہے کب سے
مسافت ہے کسی کوہِ ندا کی

زمیں پر پاؤں پڑتے ہی نہیں ہیں
کہیں تو انتہا ہو انتہا کی

چبھن سی عمر بھر محسوس کی ہے
تعاقب میں رہی ہے چشمِ شا کی

سمندر سر اُٹھا لے آسماں تک
مدد ہاتھوں میں لے لے گی دعا کی

ظفرؔ مجھ کو نہ درسِ زندگی دو
کہ بود و باش ہے دشتِ بلا کی



نقوش جذبِ دروں کے جیون پہ گہرے دیکھے
نہالِ شب کے تمام پنچھی سنہرے دیکھے

بس ایک ساعت کی برقِ حیرت گری تھی مجھ پر
وہی ہے منظر کہ جس پہ قرنوں کے پہرے دیکھے

نحیف لوگوں پہ اپنی قدرت دکھا رہے ہو!
وہ جس کی قدرت میں تم ہو، اُس کے کٹہرے دیکھے؟

ابھی تلک نیکی و بدی میں نہ فرق جانا
اگرچہ تم نے بھی زندگی بھر دسہرے دیکھے

سنائی دیتے نہیں اُنہیں گیت رنگ و بو کے
دیارِ فطرت کے سارے انسان بہرے دیکھے



پھاند لی ہر رہِ قاتل کی دراڑ
کھا نہ لے اب مجھے منزل کی دراڑ

گڑ گئیں میخیں تری یادوں کی
بھر گئی خون سے پھر دِل کی دراڑ

کتنی آسانی سے پاٹی اُس نے
ہجر کے کلیۂ مشکل کی دراڑ

کھینچ لے نہ ترے افلاک کو بھی
یہ جو ہے ایک خطِ گِل کی دراڑ

ہر طرف لمس ہے اَن دیکھا سا
روح تک پھیلی ہے مَوصِل کی دراڑ

لوحِ عالم پہ صدائیں بو دے
کچھ لکھے دیدۂ بسمل کی دراڑ

کب نگل پائی مرا کارِ جنوں
کسی مفعول یا فاعل کی دراڑ

غرق کر دیتی ہے تنہائی میں
نظر آتی نہیں محفل کی دراڑ

کل یہیں سے نہ تمہیں آلے بھنور
دیکھ لو آج ہی ساحل کی دراڑ





جو تیرہ بختِ زماں ہیں، دعائیں اُن کی لیں
چراغِ شب کی طرح اِس دیار میں جی لیں

مرا نصیب وہی کُنجِ شورشِ ہجراں
وہی بلاتی ہوئی رنگ و بو کی تمثیلیں

ابھی لہو کی ہوس میں تنی ہیں بندوقیں
ابھی پرندوں سے خالی نہیں ہوئیں جھیلیں

جو راہِ راست ہے، ہم نے اسی پہ چلنا ہے
یہ سنگریزے بھلے اپنے دست و پا چھیلیں

حیات ایک حوادث کا سلسلہ ٹھہرا
گڑی ہوئی ہیں مرے سینے میں کئی کیلیں

کسی کی یاد مرے شبکدوں میں در آئے
کسی کے غم میری نیندوں کا سارا نم پی لیں

فسانے سوزِ دروں کے پڑھے تو کھل پائے
کہ اختصار میں ہوتی ہیں کتنی تفصیلیں

اِک ایسی بزمِ چکاچوند میں ہوں نورطلب
اندھیرے بانٹ رہی ہیں جہاں کی قندیلیں

خدا کا شکر کہ عمرِ رواں سے کچھ کم ہیں
مرے لئے کسی عیسیٰ نفس کی تعجیلیں

جو کرنے والے ہیں وہ کام کر گزرتے ہیں
بنانے والے بناتے رہیں گے تاویلیں

کسی کے ظرف نے پیچیدہ سی بنا دی ہیں
ظفرؔ کی سادہ مزاجی کی ساری تسہیلیں





کیسے سمٹ سکیں دِل و جاں کی اداسیاں
قالین جیسی ہیں اِس مکاں کی اداسیاں

لگتا ہے جیسے عمر کے ایک ایک پل میں ہوں
اِک مضمحل سے کنجِ گماں کی اداسیاں

یادوں پہ پڑ رہی ہے گئے موسموں کی اَوس
محوِ سفر ہیں ابرِ رواں کی اداسیاں

اپنے فشار میں ہیں بہاروں کے سوگوار
اپنی بہار میں ہیں خزاں کی اداسیاں

جلتا ہوا چراغ ہوں دِل کے مزار پر
مجھ میں بھری ہیں پونم شباں کی اداسیاں

تیری محبّتوں نے سکندر بنا دیا
میرے لئے ہیں سارے جہاں کی اداسیاں

جیسے یہ لازمہ ہوں سبھی ماہ و سال کا
یہ جنوری کے اُجڑے سماں کی اداسیاں

اب کے چلا دئے سبھی سکّے وفاؤں کے
ہم نے خرید لیں سب دکاں کی اداسیاں

کارِ سخن وراں ہے سو کرتا ہوں منعکس
ہر آئینے سے عکسِ بیاں کی اداسیاں





مرے وطن کی فضا انقلاب مانگتی ہے
یہ خلق اب کوئی روزِ حساب مانگتی ہے

ہماری نسل کو زنگار نہ نگھل لے کہیں
نیا جہاں، نئی تعبیرِ خواب مانگتی ہے

ترازو والوں پہ اٹھنے لگی ہے ہر انگلی
یہ محتسب کا بھی اب احتساب مانگتی ہے

خودی سے آج بھی قوموں کی آبرُو قائم
یہ جنگ اب بھی لہو کا نصاب مانگتی ہے

ہمارے ظرف کی تشنہ لبی نہیں جاتی
کہ یہ قمر نہیں اب آفتاب مانگتی ہے

حیات میں نہ سما پائی خودنوشت مری
کتابِ عمر میں اِک اپنا باب مانگتی ہے

ہماری قوم بھی کیسی انوکھی لاڈلی ہے
غلام بن کے حق انتخاب مانگتی ہے

بھلا دیا نمِ گیتی کو ریگِ صحرا نے
ہمک ہمک کے فلک سے سحاب مانگتی ہے

ہمیشہ پھیرے لگاتی ہے خلوتِ شب کو
کسی کی یاد جمالِ حجاب مانگتی ہے

کلام کرتی نہیں کوئی اِس قدر ہے خفا
پر اُس کی مانگ تو از خود گلاب مانگتی ہے

ہوس نہیں ہے کسی وعدۂ اِرم کی ظفرؔ
یہ آنکھ ایک نظر کا ثواب مانگتی ہے





اپنے ہونے پہ فقط میں ہی ہوا نہ جزبز
عمر بھی کر کے ہے جینے کا بہانہ جزبز

اپنے کردار سے سمجھوتہ نہیں کر پاتا
مجھ سے رہتا ہے بہت میرا فسانہ جزبز

اپنی ہر راہگزر آپ تراشوں گا میں
اِس پہ ہوتا ہے تو ہو جائے زمانہ جزبز

مشتمل کتنے حوادث پہ ہے ترکیبِ وجود
عکسِ سنگ زاد سے ہے آئینہ خانہ جزبز

قتل کرتا رہا بیچاروں کو لمحہ لمحہ
رہا مقتول سے قاتل کا گھرانہ جزبز

اُس کو ویرانہ بھی آباد نہ کرنے دے گی
اپنی وحشت سے ہے خود کوئی دوانہ جزبز

کون ہوں، کیسا ہوں اِس کا تو ہے اندازہ درست
کس لئے ایسا ہوں، اِس پر ہے قیافہ جزبز

اِن کی باتوں نے چکاچوند سا کر رکھا ہے
نئے لوگوں سے ہے ہر شخص پرانا جزبز

کوئی رہتا ہے ظفرؔ نانِ جویں پر قانع
اور پا کر کوئی دنیا کا خزانہ جزبز





ملے تو خوشگواریوں سے وہ بھرے تو بات ہے
نکل پڑے کسی کے ہونٹوں سے ارے تو بات ہے

درخت اور آدمی میں فرق ہونا چاہیے
سبھی رتوں میں ہم رہیں ہرے بھرے تو بات ہے

برت سکیں ہم آپ اُن سے بے رخی نہیں نہیں
اگر وہ ہم سے خود رہیں پرے پرے تو بات ہے

کسی کو دیکھنے سے سیرِ چشم ہونا چاہیے
کسی کی دید سے ہمارا دل بھرے تو بات ہے

شکم کی آگ نے جلا کے رکھ دیے ہیں خواب بھی
یہ فیل اپنے نیچے آکے نہ مرے تو بات ہے

اگرچہ اب معاملے دِلوں کے معتبر نہیں
یہ سکّے کھوٹے دور میں رہیں کھرے تو بات ہے

ازل سے شور سنتے آئے ہیں حکیم وقت کا
کسی طرح ہمارے زخم بھی بھرے تو بات ہے

تُو بن طلسمِ شب شکن، سحر کی اوّلیں کرن
جو کوئی بھی نہ کرسکا وہ تُو کرے تو بات ہے

یہ قوم ہر کسی کی ٹھوکروں پہ کیوں پڑی رہے
چلے ہتھیلی پر چراغِ جاں دھرے تو بات ہے





یارانِ بے نوا کی سبھا ہے وہیں کہیں
خاموشیوں سے حشر بپا ہے وہیں کہیں

مارا تھا جس مقام پہ جیون کی پیاس نے
مجھ کو یقیں تھا آبِ بقا ہے وہیں کہیں

تم جشنِ آفتاب مناتے ہو جس جگہ
ہم کو بجھا چراغ ملا ہے وہیں کہیں

جتنی گھٹن ہے، آپ کے کُنجِ قفس میں ہے
محوِ خرام بادِ صبا ہے وہیں کہیں

اِک کہکشاں سی راہ نکلتی ہے اُس طرف
پر سوچ لو کہ اندھا خلا ہے وہیں کہیں

پہلو سے دِل تو ساتھ ہی اُس کے چلا گیا
وہ کیا ہے جو دھڑکتا ہوا ہے وہیں کہیں

لے کر میں آ گیا تھا جہاں کی سبھی رتیں
سنگ زار میں گلاب کھلا ہے وہیں کہیں

منزل پسِ گمان خفی تھی جہاں جہاں
گم گشتہ راستہ بھی رہا ہے وہیں کہیں

ٹکرا کے آستانے سے سر پھوڑ لو ظفرؔ
یا مان لو کہ وقتِ دعا ہے وہیں کہیں





دِل میں تیری یادوں کے عجب پھول کھلے ہیں
مہکا ہوا ہے گوشۂ شب، پھول کھلے ہیں

وہ چہرہ نہیں فصلِ گل و لالہ ہے کوئی
وہ لب نہیں (ہلتے ہوئے لب) پھول کھلے ہیں

اب زندگی دشوار ہے، آزار ہے پیارے
کانٹوں میں پروئے ہوئے سب پھول کھلے ہیں

پھرتے ہیں عبث لے کے حوالوں کی محبت
گلشن میں تو بے نام و نسب پھول کھلے ہیں

زخموں سے مہکتا ہے مری ذات کا آنگن
یہ درد کا موسم ہے غضب، پھول کھلے ہیں

ہم ہجر کی وحشت سے نکل آئے ہیں باہر
خوابوں نے لگایا ہے نقب، پھول کھلے ہیں

جس کے بھی مقدر سے ہے، دنیا ہے دھنک رو
اب جو بھی ہے کھلنے کا سبب، پھول کھلے ہیں

خوشبو کی زبان چاہیے رنگوں کے جہاں میں
سمجھانے کو جیون کا یہ ڈھب پھول کھلے ہیں

روں روں میں اتر آئی ہے سرشاری رتوں کی
ہر پتی بنی بنتِ عنب پھول کھلے ہیں

اُس جلوے کے صدقے سے ہیں رنگیں سبھی منظر
مسکا کے دکھایا ہے تو تب پھول کھلے ہیں

تم دیکھنا، کرتا رہا جو پھول فروشی
پالے گا وہ گلچین کا لقب پھول کھلے ہیں

پت جھڑ نے جنہیں بھینچ کے رکھا ہو ازل سے
وہ کیسے بتا سکتے ہیں کب پھول کھلے ہیں

اِک پھول کی پتی تو مرے نام کی نکلے
کہنے کو یہاں کتنے ارب پھول کھلے ہیں

اب اپنا یہ قصہ بھی بہاروں کا ہو حصہ
آ دیکھیں کوئی کنجِ طرب پھول کھلے ہیں

سُن سُن کے ترا ذکر بدلتے رہے موسم
لے لے کے مرا رنگِ طلب، پھول کھلے ہیں

دِیوانے تو بیعتِ خرد کر چکے کب کے
کہتے ہیں کہ صحراؤں میں اب پھول کھلے ہیں



جادۂ دِل ہے جو معکوس تو پروا بھی نہیں
اپنے سائے تلے آ کر کوئی مرتا بھی نہیں

وہ اگر بہرِ صدا بامِ انا سے اُترے
میں وہاں سے چلا آؤں جہاں رستہ بھی نہیں

اجنبی نظریں ہیں اور دیکھنے والوں کا خروش
بھولنے والے کو اب تک کوئی بھولا بھی نہیں

پاس تھا کوئی تو چندھیائی ہوئی تھیں نظریں
اور اب دور ہے کتنا، نظر آتا بھی نہیں

کسی خوش فہمی کے احسان اُٹھائیں کیسے؟
کوئی آہٹ، کوئی خوشبو، کوئی دھوکا بھی نہیں

ٹھہر جاؤ تو یہی سر سے گزر جائے مگر
پاؤں اُٹھیں تو یہ دریا کوئی دریا بھی نہیں

جبرِ حالات نے مٹھی میں دبا رکھا ہے
دائرہ ہجر کا اُس نے تو بڑھایا بھی نہیں

اپنی بربادی کے قصے پہ ذرا غور کرو
واقعہ یہ ہے کہ یہ واقعہ بنتا بھی نہیں

بجھ گئے گیتیٔ شاداب کے اسفنج ظفرؔ
لکۂ ابر نے دامن ابھی اُلٹا بھی نہیں





جھیل کے پانیوں کی کہانی اگر آج بھی کائیوں سے لکھی جائے گی
سوچ لو، پھر نئے موسموں کی کتھا کیسی بینائیوں سے لکھی جائے گی

تم جو چپ میں قلعہ بند ہو جاؤ گے، شب پرستوں کا منتر سُنا جائے گا
رات کو بادلوں میں بُنا جائے گا، صبح پرچھائیوں سے لکھی جائے گی

اہتمامِ شفق جب کیا جائے گا، خون میری وفا سے لیا جائے گا
اور تاریخ جب بھی لکھی جائے گی، میری کج رائیوں سے لکھی جائے گی

قربتوں میں عجب فاصلے ہیں نہاں، کون طے کر سکا! عمر اِتنی کہاں!!
داستانِ رفاقت کسی کی بھی ہو، آبلہ پائیوں سے لکھی جائے گی

آ کے خلوت میں یادوں کی پریاں کبھی میرے ہر پل کی ہم رقص ہو جائیں گی
اور تنہائیوں کی اُداسی کبھی، بزم آرائیوں سے لکھی جائے گی

جن کا قبلہ نما دَر رہا دوستو! گھنگھروؤں سے چھنکنے لگا دوستو!!
ملک و ملت کی تقدیر کیا دوستو، اُن کی انگڑائیوں سے لکھی جائے گی

مصلحت سے یونہی کوئی لڑتا نہیں، اہلِ ہوش و خرد کا وطیرہ نہیں
شہر والوں کی رودادِ جبر و ستم ہمیں سودائیوں سے لکھی جائے گی

کچھ بھی لفظوں میں گھولا نہیں جائے گا، کسی جذبے کو تولا نہیں جائے گا
چشمِ عالم میں تحریر جو بھی پڑھی، دل کی گہرائیوں سے لکھی جائے گی

ہم اِسی رو میں چلتے رہے تو ظفرؔ، وقت بن جائے گا دائروں کا سفر
مدتوں بعد بھی حبس کی کیفیت، یونہی پروائیوں سے لکھی جائے گی



۹ مئی

بس ایک دن کے سفر میں کٹے ہیں کتنے برس
بس اِک دراڑ سے دو نیم ہو گئی ہے زمیں
بس ایک ضرب سے میزان ہو گئے ہیں خجل
بلیک ہول زمانوں میں کھو گئی ہے زمیں

وہ سانحہ کہ جواب بھی ہے منبعِ گرداب
یہ المیہ ہے کہ وہ سانحہ تو تھا ہی نہیں
وہ جس کے واسطے لوح و قلم خریدے گئے
وہ داستاں کا کوئی سلسلہ تو تھا ہی نہیں

یقین اب نہیں کرتے ہیں آنکھ بند کر کے
ہر اِک دلیل کو اذہان چھانتے ہیں سبھی
عیاں ہیں سب پہ پریس کانفرنس کے صدق و دروغ
جو تو بتاتا ہے ہم کو، وہ جانتے ہیں سبھی

سمجھتے ہیں ترے اخلاصِ چارہ سازی کو
مریض کون رہا ہے، علاج کس کا ہے
وہ جس بہانے کسی کو ہدف بنایا گیا
سبھی کو علم ہے "کیموفلاج" کس کا ہے





اوڑھے ہوئے ہوں بھیڑ میں تنہائیوں کا سچ
جھٹلا رہا ہوں انجمن آرائیوں کا سچ

ہر پل ہے زخم ہائے دل و جاں میں گمشدہ
نگلے ہوئے ہے درد کی پہنائیوں کا سچ

تو بھی ہے میرے نام کا طعنہ لئے ہوئے
میرے بھی ساتھ ساتھ ہے رسوائیوں کا سچ

اندھی عقیدتوں سے نمٹنے میں کامیاب
نہ روشنی کا جھوٹ نہ پرچھائیوں کا سچ

وہم و گماں کی دھند میں گم ہو کے رہ گیا
اہلِ یقیں کی جملہ توانائیوں کا سچ

تاریخ پہن لے کبھی رکھ دے اتار کے
چشمِ نظر کا بن گیا بینائیوں کا سچ

مرہم کی بات نشتر زنی تک پہنچ گئی
تیشہ بنا ہوا ہے مسیحائیوں کا سچ

کیسا ہے اندھے شہر میں آئینہ بیچنا
میرے قلم سے پوچھئے سچائیوں کا سچ

ہرگز نہیں ہے فصلِ گل و سبزہ کی نویدؔ
دِیوار و دَر سے اُبھرے اگر کائیوں کا سچ





زیست کی تلخیص ہے تیری نظر کا اقتباس
اب تو جنگل بن چکا ہے اِس شجر کا اقتباس

کہکشاؤں کے فسانے رات بھر سُنتا رہا
چاندنی میں تھا مرے خوابِ سحر کا اقتباس

ساعتوں کا ہر قدم قرنوں سا بھاری پڑ گیا
راستہ بنتا رہا رنجِ سفر کا اقتباس

زندگی بھر کی مسافت کا نتیجہ دیکھئے
سنگِ منزل نکلا میرے اپنے گھر کا اقتباس

ناگہاں تاریخ کے شعلوں نے ہم کو آلیا
بے خیالی میں لکھا جانے کدھر کا اقتباس

حُسن کا حاصل ہے کیا؟ اِک دفترِ وہم و گماں
عشق کا حاصل ہے کیا؟ اِک چشمِ تر کا اقتباس

کیا اِسی باعث ہمارا بخت ہے بے چہرگی
عکس کے زمرے میں ہے آئینہ گر کا اقتباس

وقت نے طوفان ایسے بھی رقم کر دینے ہیں
ساحلوں کا پیش رس ہو گا بھنور کا اقتباس

گھر کی بنیادوں میں کس احساس کی دیمک لگی
وہ بھی جھٹلانے لگا جو تھا ظفرؔ کا اقتباس





یہ مرا اسم کوئی پلگ تو نہیں
میں تری ذات سے الگ تو نہیں

لے اُڑی ہیں مجھے اناؤں سمیت
تیری نظریں اگرچہ ٹھگ تو نہیں

ہر مکاں میں تو لامکاں ہیں بہت
یہ جو جگ ہے یہ جملہ جگ تو نہیں

ختم ہوتا نہیں کسی صورت
عشق چائے کا کوئی مگ تو نہیں

چھوڑ سکتے ہیں حسبِ آگہی بھی
راستہ زندگی کی رگ تو نہیں

جاں کنی کے عذاب سے تو نکل
جل کے بجھ جا، یونہی سلگ تو نہیں

کیسی غرّاہٹیں ہیں، دہشت ہے
تیرا کوچہ ہے کوئے سگ تو نہیں

ہر کسی کا نشانہ بن جائے
ایسے دیوار سے تُو لگ تو نہیں

کوئی دِل سے اُتر گیا تو گیا
کسی انگشتری کا نگ تو نہیں





مجھ کو عمر کا مرکز جانا، سارا جیون پھیر دیا
تیرے ہجر کا لیپ اُٹھا کر دھڑکن دھڑکن پھیر دیا

لے کے دھنک سے قوسیں ہم نے کیوں تصویر بنائی تھی
اور پھر اب کاہے کو اُس پر کالا روغن پھیر دیا

عشق کا جذبہ ازلوں سے بے رحم شکنجے جیسا ہے
اور ہم نے مفلر کی طرح اطرافِ گردن پھیر دیا

کیسا کیسا چاند اور سورج وارا تیری راہوں پر
خوابوں کا صدقہ ٹھہرایا، سر پر فوراً پھیر دیا

میں ہوں، شب کا سناٹا ہے اور گمبھیرتا یادوں کی
گویا جسم و جاں پر بدروحوں کا مسکن پھیر دیا

میرے نام کی بازی کو کس چال نے ایسا الٹایا
مایوں بیٹھ گئی ہے وہ، ہاتھوں میں ابٹن پھیر دیا

اُس کی ساحر آنکھوں سے ہر سمت طلسمِ ہوش ربا
جس نے ساری دنیا میں اِک گھر کا آنگن پھیر دیا

عمر کی ہر تاریکی میں ہے اسمِ اعظم اُس کی لو
روشن ہے وہ لمحہ جس پر تو نے درشن پھیر دیا

ایک کسک ہے جس سے چائے کی پیالی میں طوفاں ہے
ایک خلش ہے جس نے اِن آنکھوں میں ساون پھیر دیا

مانا انسانوں نے بود و باش رکھی ہے شہروں میں
لیکن وہ جو اپنے اندر سب نے اِک بن پھیر دیا

دنیا بھر کے بے چہروں کو ظاہر کرتے پھرتے تھے
اور پھر اِک دن ہم نے اپنی جانب درپن پھیر دیا





شبِ بسیط میں صبحوں کا خواب میں ہی تھا
گو اپنی ذات میں اک آفتاب میں ہی تھا

تحفظات بہت سے سفر کے باب میں تھے
یہ اور بات کہ پا بہ رکاب میں ہی تھا

تمہاری آنکھ سے جو موجۂ لہو ہے رواں
تمہارے دِل کی یہ زنجیرِ آب میں ہی تھا

مرا فسانہ بنا ہے جواز پت جھڑ کا
کہ نوکِ خار پہ رکھا گلاب میں ہی تھا

تمہارے رستے فقط میری سمت آتے تھے
سوال سارے تھے لیکن جواب میں ہی تھا

مری وجہ سے مناظر میں رنگ جاگے تھے
اگرچہ لکّۂ ابرِ نقاب میں ہی تھا

کیا تھا جل میں کفِ اضطراب میں نے رقم
جو بن کے ٹوٹ رہا تھا حباب میں ہی تھا

مری ہی یاد ترے قلب و جاں میں کوندی تھی
وہ تیرے رخ پہ بکھرتا شہاب میں ہی تھا

پڑا رہا کوئی دانشکدہ مخمل میں
خراب میں ہی ہوا، کامیاب میں ہی تھا

میں منکشف نہ ہوا آپ اُس پہ پوری طرح
سو اس کو دوش کیا دیتا، سراب میں ہی تھا

مرے سخن کا ہی سناٹا تھا سرِ محفل
طلسمِ ہوشربائے رباب میں ہی تھا





دیکھئے تو عالمِ جدت میں ہے خاصی کشش
کافروں کی ہے مگر جنت میں ہے خاصی کشش

روز شعلوں کو بنا کے پر اُڑا آتا ہوں میں
کیا کروں، اُس دیدۂ حیرت میں ہے خاصی کشش

سانس پی جاتی ہے ڈائن دیکھتے ہی دیکھتے
پر دوانوں کے لئے الفت میں ہے خاصی کشش

روشنی میں بھی رہے، تاریکیوں میں بھی جئے
ہم نے دیکھا، دونوں ہی صورت میں ہے خاصی کشش

اُن کا چہرہ ہو تو دورِ جامِ گل بھی ہے عبث
اُن کی آنکھیں ہوں تو پھر وحشت میں ہے خاصی کشش

وہ نظر نہ آئے تو پھر دن گزرتا ہی نہیں
دِل تو بھرتا ہی نہیں، جلوت میں ہے خاصی کشش

اُن پہ ہے میری محبت کی پذیرائی کا طعن
یہ اگر تہمت ہے تو تہمت میں ہے خاصی کشش

ساحلوں سے سر پٹخ کر لوٹتی ہے کب یہ موج
آرزُو کے واسطے شدت میں ہے خاصی کشش

کس لئے اُترے کسی پایاب دریا میں کوئی
جو ادا نہ ہو اُسی قیمت میں ہے خاصی کشش

کرچی کرچی کر کے آجاتے ہیں رشتوں کو ظفرؔ
مانو نہ مانو مگر دولت میں ہے خاصی کشش



غمِ حالات کا نوحہ بھرا ہے
خراشوں سے مرا لہجہ بھرا ہے

یہ جو کہسار ہیں، وہمِ نظر ہیں
جدھر چلیے وہیں رستہ بھرا ہے

سمندر پار کر لے گا شبوں کا
چراغوں میں بڑا جذبہ بھرا ہے

میں ایسا بھی تماشا تو نہیں ہوں
یہ کاہے کو ہر اک غرفہ بھرا ہے

دکھا سکتا ہے بندہ پروری بھی
ابھی اس شیر کا معدہ بھرا ہے

قدم رکھنا ذرا دلدل سے بچ کے
یہ دنیا ہے، یہاں دھوکہ بھرا ہے

گھری ہے بھیڑ میں تنہائی میری
کسی کی یاد سے کمرہ بھرا ہے

دلیلیں دیتا ہے ترکِ وفا کی
حوالوں میں مگر رشتہ بھرا ہے

مدلّل چپ تو ٹوٹی ہے بالآخر
کسی نے آج ہنکارہ بھرا ہے

وہ میری جان تھی، جب وہ نہیں ہے
تو کیسے جسم کا پنجرہ بھرا ہے

وبالِ جاں تھی قیدِ عافیت بھی
بھنور میں جا کے خود غوطہ بھرا ہے

کوئی گلدان ہو نرگس کا جیسے
ظفرؔ آنکھوں سے وہ چہرہ بھرا ہے





نہیں کہ یورشِ ظلمت سے کوئی ڈر ہی گیا
اگرچہ کر کے عزاداریٔ سحر ہی گیا

عجب جنون تھا انبوہِ کجکلاہاں میں
رواں دواں تھا جدھر جوئے خوں، اُدھر ہی گیا

دِیا جلے یا بجھے، رات ہے خسارے میں
جو روشنی اسے کرنی تھی وہ تو کر ہی گیا

ہجومِ چہرہ نما میں رہا مگر خود کو
تلاش کرتا ہوا آئینے کے گھر ہی گیا

جہاں پہ مجھ کو سکھانا تھا زندگی کا ہنر
میں اُس دیار میں بہرِ حیات مر ہی گیا

ڈبونے والے ہمیشہ ڈبونے والے رہے
کبھی میں ڈوب رہا اور کبھی اُبھر ہی گیا

بچھے ہوئے ہیں فضاؤں میں سینکڑوں پھندے
یہ جان کر بھی پرندہ اڑان پر ہی گیا

جہاں پہ گھات لگی تھی عدوئے جاں کی ظفرؔ
اُسی گلی سے گزرنا تھا سو گزر ہی گیا



کہہ دو!

کہہ دو !
جو کہنا ہے
سننے والا ہے وہ
تیری ہر ہر حاجت پوری
کرنے والا ہے وہ
وقتِ دعا ہے
کہہ دو !!



سبھی کے یار میرے ہم نشینوں سے نکلتے ہیں
دِلوں میں رہتے ہیں پر آستینوں سے نکلتے ہیں

ترا ارمان مشاطہ ہمارے روز و شب کا ہے
سو بے ترتیب ہو کر بھی قرینوں سے نکلتے ہیں

فقط موجوں سے لڑنے کا ہنر کافی نہیں ہوتا
بھنور کچھ ایسے بھی ہیں جو سفینوں سے نکلتے ہیں

سبھی تیری ہوا کے رخ پہ چل سکتے نہیں ہرگز
ہم ایسے بھی زمانے کے دفینوں سے نکلتے ہیں

دِلوں سے جو کیا غم نے کہاں بھونچال کر پایا
خراشوں کے وہ نقشے آبگینوں سے نکلتے ہیں

جہاں غیرت کے ماروں کو لہو بونے کی عادت ہو
وہیں تو آسماں زادے زمینوں سے نکلتے ہیں

ہم اِس پر بھی ہیں ذمہ دار خود اپنی تباہی کے
ہمارے خواب مسروقہ حسینوں سے نکلتے ہیں

یہ کیسا سحر ہے کہ خوف نے ہر شے کو جکڑا ہے
ہوا کیا ہے کہ اب کے سانپ بینوں سے نکلتے ہیں

ظفرؔ کافی نہیں ہوتی ہے ساری عمر کی نقدی
مکاں کے قرض ہی اکثر مکینوں سے نکلتے ہیں





اَن کہی سی جو یہ بھاشاؤں کے اندر ہے کہیں
ایک طوفان شکیباؤں کے اندر ہے کہیں

ریت کے ٹیلے لرزتے ہیں مری دھڑکن سے
میں وہ دریا ہوں جو صحراؤں کے اندر ہے کہیں

مندمل ہونے نہیں دیتا مرے زخموں کو
ایک قاتل جو مسیحاؤں کے اندر ہے کہیں

میری آئندہ مسافت کا تصور جھلسے
اُس تپش سے جو ابھی چھاؤں کے اندر ہے کہیں

لوگ فرلانگ کی دوڑوں پہ ہیں میرا تھن میں
ماندگی بادیہ پیماؤں کے اندر ہے کہیں

کیوں سرابِ لب و رخسار میں الجھا ہوا ہے
یار! رعنائی تو رعناؤں کے اندر ہے کہیں

حوصلے نقشہ نویسانِ مقدر ٹھہرے
اِک نوشتہ میری ریکھاؤں کے اندر ہے کہیں

خودبخود عشق کا سرکٹ تو مکمل نہ ہوا
قیس کا رنگ بھی لیلاؤں کے اندر ہے کہیں

شہر کو اوڑھ لیا ہے میرے جیون نے ظفرؔ
اور دِل ہے کہ ابھی گاؤں کے اندر ہے کہیں





یادیں ہیں یا بیداد بلاؤں کی کمندیں
راتیں ہیں یا اِس دل پہ گھٹاؤں کی کمندیں

سوچا نہ ترے حسنِ جہاں سوز نے مطلق
کس کس پہ پڑیں گی یہ اداؤں کی کمندیں

ہر روز وہی دھوپ کا جلتا ہوا دن ہے
ہر رات وہی خواب سراؤں کی کمندیں

بے نور چراغوں کو لئے پھرتے ہیں رہرو
پڑ جائیں لوؤں پر بھی ضیاؤں کی کمندیں

گڑنا ہے علم کون سے جھونکے کا دیے پر
ہر سمت سے آتی ہیں ہواؤں کی کمندیں

بے جان بتوں میں بھی کبھی جان پڑے گی
پھینکی ہیں مری چپ نے صداؤں کی کمندیں

پڑنے تھے قدم جادۂ ہستی پہ ہمارے
یہ آن پڑیں کیسے خلاؤں کی کمندیں

آخر وہ پکڑ لے گا ترے دستِ ستم کو
اونچی ہیں ترے قد سے دعاؤں کی کمندیں

کچھ بھید نہیں کھلتا ترے فیض کا ہم پر
ظلمت کا شکنجہ ہے یا چھاؤں کی کمندیں





صَرف اِسی پر ظرف کی چھاگل کر دیں گے
صحراؤں کو جلتھل جلتھل کر دیں گے

صدیوں جتنا عمر کا ہر پل کر دیں گے
تیرے غم ہر سانس کو بوجھل کر دیں گے

قید کریں کیوں خود کو ذات کے زنداں میں
خواب بنیں گے، اُڑتے بادل کر دیں گے

اِتنے بھی نزدیک نہ آ دیوانوں کے
خود سے اپنا ربط معطل کر دیں گے

در آئیں گے تو پھر یہ ہجراں کے غم
جیون کو تا عمر مقفل کر دیں گے

اِتنے ارماں، اتنی ہوس اور اِتنے خواب
آپ تو اپنے آپ کو جنگل کر دیں گے

باتوں کا دم گھونٹنے والے یاد رکھیں
یونہی حبس رکھا تو پاگل کر دیں گے

رہبر تو بن جائیں گے اوہام مگر
سارا رستہ گنجل گنجل کر دیں گے

رن کا بلاوا آیا تو یہ کومل ہاتھ
پرچم اپنے اپنے آنچل کر دیں گے

میرے قتلِ ناحق پر لب بستہ لوگ
اِک دن سارے شہر کو مقتل کر دیں گے



کسی جمال پہ دیکھا بشر بشر رقاص
پڑا دھمال تو پائی نظر نظر رقاص

وہ لے اٹھاؤ، قدم آپ ہی تھرکنے لگیں
ہوا کے گیت پہ جیسے شجر شجر رقاص

سرود ٹوٹ گیا پر وہ لے نہیں ٹوٹی
بنا کے رکھا ہے جس نے نگر نگر رقاص

یہ رقص گاہِ زمانہ، یہ جوششِ ہستی
یہ جھومتے ہوئے پل یہ اِدھر اُدھر رقاص

سکوتِ شب میں کہاں بانسری کے سُر بکھرے
فسردہ سینوں میں جاگے کدھر کدھر رقاص

ہمیشہ سے ہے تموّج کا شوق زندوں کو
کہ موج موج رہی ہے بھنور بھنور رقاص

فنا کا سحر چلے کیا دھڑکتے رستوں پر
حیات بانٹ رہی ہے ڈگر ڈگر رقاص

چراغِ شب کی دعائیں ہتھیلی پر رکھے
کرن کرن نظر آئے سحر سحر رقاص

کسی کی یاد نے محفل عجب جمائی ہے
غزل غزل ہے ترنم، ظفرؔ ظفرؔ رقاص





زندگانی کا کوئی سینہ سپر ہے مقروض
آندھیوں کا کوئی ٹوٹا ہوا پر ہے مقروض

اب تو دفتر میں بھی بج اُٹھے ترے غم کا الارم
ایسی فرصت کا کوئی کارِ دگر ہے مقروض

زیست کیوں رنگ پکڑتی ہے بدلتی رت کا
یہ وہ نظارہ نہیں جس کی نظر ہے مقروض

یوں اُڑا جاتا ہوں جیسے یہ مرا ذوقِ سفر
کسی منزل کا سرِ راہگزر ہے مقروض

ایسے بیگار کا قائل تو نہیں ظرفِ جنوں
موجۂ خون میں پلتا ہوا ڈر ہے مقروض

زخمِ ساعت کئی قرنوں میں بھرا (بھر تو گیا)
دلِ نادان مگر زندگی بھر ہے مقروض

کام اپنا تھا یا اِس کا جو کیا ہے شب بھر؟
مفت میں چاند ستاروں کی سحر ہے مقروض

پیچھے اِس کی بھی چھاؤں نے دیئے تھے اُن کو
کچھ پرندوں کا اگر آپ شجر ہے مقروض

اوّلیں سانس بھی بوجھل سی ملی ہے سب کی
کیسے بتلاؤں کہ کب کون کدھر ہے مقروض

قاب کس فرد کے کمرے میں گئی ہے، دیکھو!
بِل چکانے کے لئے سارا ہی گھر ہے مقروض

تیری یادوں نے ہمیشہ اِسے مصروف رکھا
تیرا احسان ہے تسلیم، ظفرؔ ہے مقروض



یہ جگ!

رستہ
بہرِ منزل
کھینچے لے جاتا ہے
عمر کا ہر ڈگ جیون جتنا
خوشیوں اور غموں کا ساماں سارا
کاندھے پر رکھ کر ہے چلنا
جگ میں پھیلاتا ہے
سحرِ منزل
رستہ



اِک دیئے سے بھی صبا رنگ پکڑ لیتی ہے
چاند تاروں سے سوا رنگ پکڑ لیتی ہے

معجزے اُگتے ہیں بس خوابگہِ عالم میں
پاک مٹی ہے، ہرا رنگ پکڑ لیتی ہے

ہم وہی نقشِ کہن کے ہیں محبت زادے
سرخرو ہیں کہ وفا رنگ پکڑ لیتی ہے

تیرے جلوے میرا ماحول بنا دیتے ہیں
مسکرانے کی ادا رنگ پکڑ لیتی ہے

زیست زرخیز زمینوں میں نمو پاتی ہے
گورے ہاتھوں میں حنا رنگ پکڑ لیتی ہے

جب کوئی غنچۂ امکان مہک اُٹھتا ہے
جاگ جاتی ہے صبا، رنگ پکڑ لیتی ہے

گھیر لیتی ہیں خزاؤں کی بلائیں ہم کو
تو پسِ انداز دعا رنگ پکڑ لیتی ہے

کیوں چلے جبر کے موسم سے نظامِ فطرت
کس طرح خلق خدا رنگ پکڑ لیتی ہے

مجھ میں بھر جاتی ہے طوفانِ بلاخیز کے بعد
اِس قدر چُپ کہ صدا رنگ پکڑ لیتی ہے

جو فضا اپنا کوئی رنگ نہیں رکھتی ظفرؔ
رت بدلتے ہی نیا رنگ پکڑ لیتی ہے



کٹی ہے رات پھر بیداریوں میں
تری یادوں کی مہماں داریوں میں

دِلوں کے زخم تو چھپتے نہیں ہیں
تبسم کی ملمع کاریوں میں

مسافر آتے جائیں، جاتے جائیں
کسی رستے کی پراسراریوں میں

مرا حق مجھ کو ایسے مل رہا ہے
بٹے امداد جیسے ہاریوں میں

کسی کے غم کو سینے سے لگا لوں؟
اضافہ کر لوں ذمہ داریوں میں؟؟

سفر آغاز کر پایا نہیں ہوں
میں تھک کر رہ گیا تیاریوں میں

اُسے آتا نہیں کوئی نشہ خوش
رہا جو ذات کی سرشاریوں میں

اگرچہ کارِ آرائش کیا ہے
مگر خود گم گیا ہوں دھاریوں میں

ہماری زندگی کا کیا ہوا ہے
ظفرؔ اِن روز و شب کی باریوں میں





میرے معیار پہ مقہور بھی آپایا نہیں ہے
اُس پہ رنگِ شبِ عاشور بھی آپایا نہیں ہے

وقت کی ایسی بھی فائل لئے پھرتا ہوں بغل میں
جس میں لکھا ہوا ''منظور'' بھی آپایا نہیں ہے

دیکھ لے! اپنے مقلد کو تُو لے آیا کہاں پر
اِس جگہ باغیٔ مقدور بھی آپایا نہیں ہے

بار و گل بعد کا قصہ ہے ابھی تم یہی دیکھو!
نخل ہستی پہ کوئی بور بھی آ پایا نہیں ہے

طعنۂ ساقی گری تیری نگاہوں پہ لگا دیں
اِتنی سرشاری میں مخمور بھی آ پایا نہیں ہے

عشق کس موجِ مشقت میں بہا لایا کہ جس میں
زندگی کا کوئی مزدور بھی آ پایا نہیں ہے

رت بدلنے پہ بھی گم گشتہ رہے گردِ گماں میں
کسی چہرے پہ ذرا نور بھی آ پایا نہیں ہے

قریۂ جبر میں ہم پیروی کرتے بھی تو کس کی
جادۂ حق پہ تو منصور بھی آ پایا نہیں ہے

سب اگلتے رہے برسوں کے چبائے ہوئے لقمے
بزم میں شاعرِ بھرپور بھی آ پایا نہیں ہے



کاش!

شمع!
ہر شب سہتی
تاریکی کے رستے
کر جاتی مسدود جہاں سے
روشن رہتے رستے
جلتی رہتی
شمع



چاند لکھتا تو رہا ہے گریۂ پیہم کے خط
دیدۂ افلاک سے ڈھلکے تو ہیں شبنم کے خط

بجلیاں لایا ہے بادل یا نویدِ فصلِ گل
ڈاکیے کے ہاتھ میں ہیں کون سے موسم کے خط

شکر ہے گم گشتہ لوگوں کی خبر آئی تو ہے
اس خوشی میں ہم کو پکڑا ئے گئے ماتم کے خط

کیا پتہ ان قربتوں میں کون سی ہیں دوریاں
کیا خبر پڑھنے پڑیں گے ہم کو کس عالم کے خط

ہم بھی تھے نادان سے، دنیا بھی تھی جاسوس سی
مشتہر ہونے لگے دل کی نجی البم کے خط

میرے جذبوں کے لفافے بے پتہ ہرگز نہ تھے
کیوں بگولہ لے کے پھرتا ہے مرے محرم کے خط

اس لئے تو صحبتِ احساس سے ہیں بے خبر
کتنی ہی نسلوں تلک پہنچے نہیں آدم کے خط

کھردرے لوگوں کے جذبوں سے نہ کر صرفِ نظر
تیری آنکھوں کے لئے لکھتے ہیں کیا ریشم کے خط

خط ہوئے برقی تو کیا لکھنے کی فرصت نہ رہی
ایک مدت سے نہیں آئے مرے ہمدم کے خط





کیسے کیسے سفر بہہ گئے
موجۂ خون پر بہہ گئے

لوگ موجوں کی کشتی پہ ہیں
خود میں گویا بھنور بہہ گئے

گھر تو جوہڑ تھا تیزاب کا
بسکہ بیرونِ در بہہ گئے

خوابگینوں کو روکو گے کیا
اپنی رو میں اگر بہہ گئے

عمر کے آگے بس نہ چلا
زندگی کے ہنر بہہ گئے

ڈوبے پایاب امواج میں
تھے شناور مگر بہہ گئے

تیرنا سیکھتے سیکھتے
ہم نہ جانے کدھر بہہ گئے

سبزہ و گل کی امید تھیں
جن رتوں میں شجر بہہ گئے

ہائے باوصفِ دستِ کمک
بہنے والے ظفرؔ بہہ گئے



...وطن کے ہیں

جہانِ نو کے جتنے خواب ہیں وہ سب وطن کے ہیں
جو بہرِ خطۂ شاداب ہیں وہ سب وطن کے ہیں

اُمید و آرزو و حسرت و بے تابی و جرات
دلوں میں جس قدر اسباب ہیں وہ سب وطن کے ہیں

اسی کا نام ہے جس پر نچھاور اپنا تن من دھن
کہ ہم تم جتنے بھی اعراب ہیں وہ سب وطن کے ہیں

سبھی کے سر میں سودا ہے فقط تزئین گلشن کا
تمناؤں کے جو سرخاب ہیں وہ سب وطن کے ہیں

خدا کی دھرتی پر خلق خدا کا راج ہونا ہے
جو اس آدرش کے آداب ہیں وہ سب وطن کے ہیں

وہ رفتہ ہو یا فردا، کشت ہائے سرفروشاں ہیں
انہیں کے خون سے سیراب ہیں وہ سب وطن کے ہیں

جنہیں آزادیٔ موہوم نے جیتا نہیں چھوڑا
وہ سارے دیس کے اصحاب ہیں، وہ سب وطن کے ہیں

بہت سوں کے لئے رحمت کے بادل ہیں ہمیشہ سے
ہمارے حق میں کیوں تیزاب ہیں (وہ سب وطن کے ہیں؟)

مرے اجداد نے اپنے لہو سے جن کو لکھا ہے
اگر تاریخ کے ابواب ہیں وہ سب وطن کے ہیں

رہے ہیں معرکہ آرا ہمیشہ لشکرِ شب سے
دیئے تھے، آج عالمتاب ہیں وہ سب وطن کے ہیں

بلوچی ہیں یا خیبر والے ہیں، مکے کی صورت ہیں
یا اہلِ سندھ ہیں پنجاب ہیں وہ سب وطن کے ہیں

عدو کے سامنے سارے محاذوں پر ڈٹے ہیں سب
سو اس شمشیر کی جو آب ہیں وہ سب وطن کے ہیں

جو بام و در ہیں اس کے نظریئے کے ہیں جلی خاکے
نقوشِ منبر و محراب ہیں ہیں وہ سب وطن کے ہیں

اُڑانوں کا ہو جذبہ تو قفس کو لے کے اڑ جائیں
ظفرؔ خوابوں کے جو عقاب ہیں وہ سب وطن کے ہیں





جیون پہاڑ سا ہے
جینا جگاڑ سا ہے

کس کس نظر میں سنوروں
خاصا بگاڑ سا ہے

توبہ وہ شخص کیسا
سرحد کی باڑ سا ہے

دِل تک پہنچنا ہو تو
چہرہ کواڑ سا ہے

تیرے بغیر عالم
جنگل اجاڑ سا ہے

رستی ہیں تیری یادیں
ہر پل دراڑ سا ہے

سر پر ہے دھوپ کی چھت
بادل تو آڑ سا ہے

ناگفتنی ہے کیا کچھ
سینے میں ساڑ سا ہے

چندا نہیں چپاتی
تو پھر کباڑ سا ہے





جھوٹی انا کی ضد میں سچ سے بگڑ نہ جانا
اُس کے حسین دل میں بس کر اجڑ نہ جانا

منزل کی باہیں جانے کب سے کھلی ہوئی ہیں
تم سنگِ میل بن کر رستے میں گڑ نہ جانا

سپنے ہیں چلتے پھرتے قوسِ قزح کے بادل
اِن تتلیوں کے پیچھے خود سے بچھڑ نہ جانا

آنکھوں میں رتجگوں کی پڑ جائیں گی دراڑیں
اِن آئینوں پہ پتھر یادوں کے جڑ نہ جانا

ٹانکے جراحتوں کے اِک عمر نے لگائے
ہر لمحے سے الجھ کر، پھر سے ادھڑ نہ جانا

ٹکرا رہے ہو سب سے، ہر رشتے ہر نسب سے
خود اپنے سائے سے بھی آخر جھگڑ نہ جانا

خود سے بلند ہو کے اُڑ پاؤ گے کہاں تک
مت چھوڑنا زمیں کو، جڑ سے اکھڑ نہ جانا

یہ تیرگی تو فتنہ ہے کائنات بھر کا
اِک طاق کے دیے ہو، بے خوف لڑ نہ جانا

مانا سماجِ نو سے ہے آب و گل تمہاری
تہذیب کے نمو سے یکسر نچھڑ نہ جانا



خزاں نژاد مسافر

دیکھ آیا ہوں میں تا حدِ نظر
کوئی منظر نہیں محفوظ کہیں
وقت کی آنکھ میں جیسے اب کے
دھوپ نے گاڑ دیے ہوں پنجے

اور موسم کی جبلی رنگت پر
خاطرِ باغ ہو ملحوظ کہیں
ایسا ہونے نہیں دیتی ہے قضا
خواب ہو جاتے ہیں ازخود ہی فنا

سر جھکائے ہوئے بیمار شجر
زیرِ اندیشہ میں ملفوظ کہیں
اپنے بکھرے ہوئے پتے دیکھے
کون سی رت کے وہ رستے دیکھے

باندھ کر نکلوں کیا تعویزِ سفر
کس ڈگر نے کیا محظوظ کہیں
پاؤں کے نیچے کچل کر خود کو
کوئی چل پائے کہاں تک یارو!





مفہومِ آزادی وسیع
یہ جیل (دنیا) بھی وسیع

کر لے گزارا زیست بھر
آگے ہے پگڈنڈی وسیع

دنیا میں ٹھہرے تو ملی
یہ جھونپڑی خاصی وسیع

پھیلے ہوئے اوراق ہم
کرنے لگی آندھی وسیع

دِل میں سمٹ آیا جہاں
یہ کٹیا بھی ٹھہری وسیع

جتنی ہوس کو چاہیے
اُتنی کہاں دھرتی وسیع

اِک ذکر سے ہے نطق کی
تنگنائی بھی کتنی وسیع

اِک جست میں طے ہو مگر
احساسِ پہنائی وسیع

فاتح دلوں کا بن ظفرؔ
ہو سلطنت تیری وسیع





کس کے لئے سینہ زمیں کا پھٹ گیا
وہ پیڑ تو اپنی جڑوں سے کٹ گیا

ساحل تلک آئی زمیں کس زعم میں
دریا تو اپنی حد سے پیچھے ہٹ گیا

ہاتھوں میں ڈالے ہاتھ موجوں نے مگر
پانی کئی بحرین میں بٹ بٹ گیا

آیا تھا آتے آتے شہرِ جاں میں
جانے لگا تو بے وفا جھٹ پٹ گیا

کب تک چھپی رہ سکتی تھی بے چہرگی
یہ وقت تو پلٹا کے ہر گھونگھٹ گیا

ہر بار دروازے کو لپکا ہے گماں
ہر بار جھونکا دے کے اک آہٹ گیا

امشب بھی میری ٹکٹکی سی بندھ گئی
دِل کی طرح کچھ چاند بھی گھٹ گھٹ گیا

یہ جان کر بھی پیٹھ دکھلائی نہیں
جو معرکے میں ڈٹ گیا وہ کٹ گیا

اس واسطے ہر عکس بے اسلوب ہے
ہر آئینہ گردِ نظر سے اٹ گیا

جرگے میں تو صلح صفائی ہو گئی
جو بات کی تہہ میں تھا، کب تلچھٹ گیا

طوفان جس پر چل کے آیا تھا ظفرؔ
اُس راستے کو کر کے کیوں چوپٹ گیا





سب لوگ اپنے اپنے فسانے میں قید ہیں
ہم ہیں کہ اب بھی تیرے نشانے میں قید ہیں

یہ زندگی تو سانپ کا سیڑھی کا کھیل ہے
سارے وسیلے خفیہ خزانے میں قید ہیں

یہ اِن کو کس کے خول میں رہنے کی ہے سزا
بے چہرہ لوگ آئینہ خانے میں قید ہیں

اپنے مہاجرین ستاروں کی خیر ہو
یہ دن کے رشتے شب کے گھرانے میں قید ہیں

جو جا چکے ہیں، ہجر کی تاریخ بن گئے
جو رہ گئے ہیں گزرے زمانے میں قید ہیں

ایف آئی آر کٹ گئی اپنے ہی قتل کی
ہم ملزمان وقت کے تھانے میں قید ہیں

اہلِ خرد بھی اب کے برآمد نہ کر سکے
وحشت کے جتنے رنگ دوانے میں قید ہیں

دستِ سبیل شیر کو ہی ڈس نہ لے ظفرؔ
وہ سانپ جو ہوس کے مکھانے میں قید ہیں





سدا سے آگہیٔ حق بنیادی بھی رکھتے ہیں
کہ بازوؤں کو پرچم، لب کو فریادی بھی رکھتے ہیں

کیا نہ جا سکا جیون سے منہا بے وفاؤں کو
اگرچہ ہم بھلا دینے کی آزادی بھی رکھتے ہیں

لگا رکھا ہے پھر بھی ارمغانِ ہجر کو دل سے
یوں کہنے کو دلیل اجرِ دلشادی بھی رکھتے ہیں

نہیں ہیں بے ثمر اتنے کرخت و بالا سر پربت
یہ اپنی گود میں اک ارغواں وادی بھی رکھتے ہیں

رموزِ گیتی اسرارِ سماء گم گشتہ ہیں کیسے
کہ استادوں میں ہم تو رومی و سعدی بھی رکھتے ہیں

ہمارے ساتھ وہ ہے جس سے کوئی جیت نہ پائے
یک و تنہا نہیں ہیں دستِ امدادی بھی رکھتے ہیں

سکونِ دل کی حسرت میں عمر ہا بیت جائے گی
اگر ہم زیست میں عشقِ اگروادی بھی رکھتے ہیں

تری یادیں چراغاں سا کئے رکھتی ہیں اس دل میں
ہم اپنے خانۂ ویراں میں آبادی بھی رکھتے ہیں

کسی کے پیار کی سوغات ہے سو ہم کو پیاری ہے
ظفرؔ ہم اہتمامِ جشنِ بربادی بھی رکھتے ہیں



خزاں؟

خزاں نہ ہو
امنگوں کے شجر سے تو
کبھی از خود گرا کرتے نہیں پتے
ارے ناداں! کہیں یہ وقت کا فطری عمل نہ ہو
جسے دل سے لگائے بیٹھا ہے کب سے
نکلنے والی باغوں کو
خزاں نہ ہو!



مہر جیسا ہے تری ایک جھلک کا ابلاغ
جیسے تحسینِ ہو نظروں میں دھنک کا ابلاغ

گھر میں گھر کرتی ہے تہذیب یہاں چپکے سے
آنگنوں میں سے گزرتا ہے سڑک کا ابلاغ

اُس کو خوش آتی نہیں تیرہ شبوں کی پستی
چاند تاروں کی چمک میں ہے فلک کا ابلاغ

اِن کے ادراک میں بیماریٔ دِل ہے شائد
چارہ گر کو کہاں سینے کی کسک کا ابلاغ

ہوش مندوں کو ہی رہتی ہے غدر کی سُن گُن
سننے والوں کو ہے قدموں کی دھمک کا ابلاغ

لے کے پھرتی ہے صحیفۂ مقدس کی طرح
اِک صبا پر ہی ہوا تیری مہک کا ابلاغ

فاختاؤں کو بھی تیروں میں پرو لیتے ہیں
جنگجوؤں کو کہاں اِن کی کمک کا ابلاغ

اُڑ کے پہنچے ہیں مسافر سبھی منزل منزل
جب دماغوں میں گیا پائے سبک کا ابلاغ

محو ہو جائے گئے وقتوں کی تلخی یا رب!
میٹھا کر دے مرے لہجے کی گزک کا ابلاغ

میری غزلوں سے تو رِستا چلا جاتا ہے ظفرؔ
بولتی آنکھ پہ ختم ہوتی پلک کا ابلاغ



کسی عفریت سے کیا ہولنا ہے
اُسی کی سائیکی میں بولنا ہے

یہی شہرِ ستم کی ہے روایت
صدا کی ضرب سے در کھولنا ہے

یہ میخواری کی خو ہے کائناتی
زمیں جیسا زمیں پر ڈولنا ہے

کسی کے غم میں ہے تحلیل ہونا
کوئی تیزاب خوں میں گھولنا ہے

کبھی نغمہ سرِ کوئے رواں تھا
کسی لاوے میں اب کے کھولنا ہے

سفر کی اب یہی غایت ہے شاید
کہ ہم کو گردِ رہ میں رولنا ہے

اُٹھا لینا جفا جوؤں کے میزاں
ظفرؔ اُن میں اُنہیں کو تولنا ہے



اور جو ۔۔۔

(عشرہ)

سلطنت پانیوں کی جو بخشی گئی
اِس کے آئین کے چاک پر زندگی
ہم کو رکھ دینی ہو گی سدا کے لئے
سب قوانین پر کرنا ہو گا عمل
سیکھنا ہو گا اپنی بقا کے لئے
کیسے موجوں پہ رکھنا ہے ہم نے قدم
کیسے طوفاں سے پنجہ لڑائیں گے ہم
کیسے چلنا ہے بچ کر بھنور سے ہمیں
ہر مساعی کریں، ساری کوشش کریں
اور جو سب سمندر بھنور ہو گیا



تیرے کوچے کے مسافر نے کہاں جانا ہے
ایک بھولا ہوا رستہ ہے، جہاں جانا ہے

فیصلہ لکھنے لگا ہے کہ مرے منصف نے
جو کسی نے نہیں دینا وہ بیاں جانا ہے

خود کو خود سے بھی چھپانے کا نتیجہ دیکھا
یوں میں ہو سکتا ہوں کس کس پہ عیاں، جانا ہے

زیست کا قرض بڑھا ہے اِسی باعث مجھ پر
میں نے ہر پل کو فقط موجِ رواں جانا ہے

بھول بیٹھے اُنہیں خورشید کے ہنگاموں میں
جن چراغوں کو سرِ تیرہ شباں جانا ہے

نیند ہر رات اُتارے میری دن بھر کی تھکن
اِس کو آغوش کے فیضان سے ماں جانا ہے

کیا کہوں رکنا پڑا ہے مجھے رستے میں کہاں
وہ پڑاؤ بھی نہیں جس کو مکاں جانا ہے

کہیں جا پایا نہیں ہوں میں اِسی ضد میں ظفرؔ
جہاں جا سکتا نہیں کوئی وہاں جانا ہے





میں رہ گیا ہو کے کتنا باہر خود اپنے بس سے، کئی برس سے
نکل نہ پایا ہوں تیری یادوں کی دسترس سے، کئی برس سے

یوں آڑھی ترچھی پہاڑیوں سے میں اپنا رستہ تراش لوں گا
وفائیں کر لیتا ہوں منعکس تری ہوس سے، کئی برس سے

مجھے کئی دوسرے حوالوں کے جھٹپٹے سے اُجالتا ہے
میں اخذ ہو نہ سکا ہوں خود اپنے مقتبس سے، کئی برس سے

ہمارے حاکم خدا کے نائب اِسی جنوں میں لگے ہوئے ہیں
پرَ ولیں سورج کسی طرح کاخ کے کلس سے، (کئی برس سے)

ہم اپنے کھیتوں کو اپنے اپنے لہو سے سیراب کر رہے ہیں
نمو نہیں مل سکی ہے اِن کورتوں کے رس سے کئی برس سے

یہ آگ بن کر تمہارے عشرت کدوں کو بھی نہ جلا کے رکھ دیں
غضب کے شعلے لپک رہے ہیں نفس نفس سے کئی برس سے

تُو چاہتا ہے تجھے زمان و مکاں سے باہر ملے وہ آ کر
نکل نہ پایا جو ایک لمحے کے ہی قفس سے کئی برس سے

یہی ہے جس نے تمہاری فرقت کا زہر مجھ میں بھرا ہوا ہے
دھڑکنے لگتا ہے دِل یہ آوازۂ جرس سے، کئی برس سے

اب اُس کے جلوؤں کے رنگ و بو کو میں اپنی غزلوں میں ٹانکتا ہوں
جو زیست ہے بے نمود، عمروں کے خار و خس سے، کئی برس سے

مرا فریضہ ہے، دھوپ سہہ کر تمام لوگوں میں چھاؤں بانٹوں
نویدؔ چر مر سا ہوں میں رشتوں کی اِس گھمس سے، کئی برس سے



دیکھو تو اپنے ہونے کا کیسا نشاں ہوں میں
مہتاب تو ہوں لیکن سرِ آبِ رواں ہوں میں

عمرِ غبی نے کی مری تفسیر ہی غلط
بوڑھا نہیں ہوں اتنا کہ جتنا جواں ہوں میں

یہ زیست تیرے ہجر کی دیوارِ زنداں ہے
اِک کوئلے سے لکھی ہوئی داستاں ہوں میں

ٹھہرے ہوئے سفینے کی کس سے لڑائی ہے
یہ کیسا پھڑپھڑاتا ہوا بادباں ہوں میں

جاری ہے مدتوں سے خموشی کا کاروبار
تمثیلچوں کے شہر میں چلتی دکاں ہوں میں

سب کی نظر میں ہوں تو میں خود کو بھی تو دِکھوں
تم سب کے درمیان ہوں لیکن کہاں ہوں میں

جائیں گی کس عدالت میں میری گواہیاں
جو لکھ گیا دھواں وہ دیئے کا بیاں ہوں میں

ہر تیرگی میں میرے حوالے کا نور ہے
زیرِ زمین ہوں یا پسِ آسماں ہوں میں

بیٹھا ہوا نہیں ہوں میں اپنے بدن کے ساتھ
کونجوں کے درمیاں کہیں پر رواں ہوں میں

تُو ہے کہ اپنے دِل کے دھڑکنے کی گونج ہے
رہتی ہے تیری یاد کہ خالی مکاں ہوں میں

جاتا نہیں ہے دل سے بھٹکنے کا ڈر ظفرؔ
ایمان کی حدوں میں ہوں لیکن گماں ہوں میں



اقصیٰ!

اقصیٰ
آنسو بن کر
وقت کی آنکھ سے ٹپکی
دنیائے اسلام کی غیرت
جاگ نہ پائی پھر بھی
سب ہیں پتھر!
اقصیٰ!!



ہونے نہیں دیتا کبھی بے گھر کوئی دھارا
اِس سارے سمندر کو سنبھالے ہے کنارا

احساس کی زنجیر میں باندھے ہے سبھی کو
ہر شخص کا ہر شخص پہ ہوتا ہے اجارا

اس بار وفاؤں کا جوا ڈھنگ سے کھیلا
تو جیت گیا ہے سو میں بازی نہیں ہارا

دی ہوتی ہے بے رحم ہواؤں نے سپاری
شعلہ تو ہے دشمن نہ ہمارا نہ تمہارا

وہ نور مری رات کا جھومر ہے جو لایا
بھر بھر کے ترے روپ سے ہر چاند ستارا

ہر یاد کو حسرت سے یوں تکتا ہوں کہ جیسے
چھوٹا ہو کسی طفل کے ہاتھوں سے غبارا

جھونکا ہے چمن کو تو کوئی بات تو ہو گی
کہتے ہیں کبھی پھول رہا ہے یہ شرارا

تُو آئے نہ آئے کسی منظر سے نکل کے
تیرے لئے جینے کا خسارا بھی گوارا

کس صبرِ مسلسل سے ہے شورش میرے اندر
کچھ کہنے کی ہمت ہے نہ چپ رہنے کا یارا





یہ کس کا ساتھ جائے
کہ دِل پر ہاتھ جائے

سحر ہی آزمائے
یا تھم کر رات جائے

مرے سائے میں کیا ہے
کرے سن ہاتھ، جائے

نفی میں ہے وہ جادو
غمِ اثبات جائے

تجھے مجبوری آ لے
مری برسات جائے

یوں اپنی کرنی کر لے
نہ میری بات جائے

مری میت اٹھائے
کوئی بارات جائے

یہ سمِ زندگی ہے
پیئے سقراط، جائے

اُمڈ آئے یوں کوئی
ظفرؔ کی ذات جائے





جیون کا دورِ جام کسی اور ہی طرف
لیکن ہے اہتمام کسی اور ہی طرف

لو لے چلا ہے ہم کو ہمیں سے ادھیڑ کے
یہ دانہ اور دام کسی اور ہی طرف

اُٹھی تھی بھاپ چائے کے کپ سے تمہارے ہاں
دھندلا گئی ہے شام کسی اور ہی طرف

رہ رہ کے گھڑسوار کے رستے میں یوں نہ آ
کہ موڑ لے لگام کسی اور ہی طرف

چند ھیا تا آ رہا تھا کسی اور سمت سے
ٹھٹھکا ہوں گام گام کسی اور ہی طرف

خوشبو کا ایک جھونکا کہیں اور لے گیا
ورنہ مجھے تھا کام کسی اور ہی طرف

لے کر نہ چل دے محنت و سرمایہ کو کہیں
تہذیب کا خرام کسی اور ہی طرف

مت کر فضائے شہر کو مسموم اس قدر
چل دیں ترے غلام کسی اور ہی طرف

کتنی حقیقتوں کو لپیٹے گیا ظفرؔ
خوابوں کا انہدام کسی اور ہی طرف





کوئی سودا بھی نہیں اور میں زندہ بھی ہوں
گویا زندہ بھی نہیں اور میں زندہ بھی ہوں

زندگی نعرۂ یاہو کی حرارت ٹھہری
لبِ گویا بھی نہیں اور میں زندہ بھی ہوں

ایک گزرا ہوا پل عمر گزارے چلا جائے
جینا آتا بھی نہیں اور میں زندہ بھی ہوں

اب ترا ذکر بھی ہے دوسری باتوں کی طرح
دِل دھڑکتا بھی نہیں اور میں زندہ بھی ہوں

---ق---

اِک اذّیت ہے مسلسل یہ مسیحائی بھی
زخم بھرتا بھی نہیں اور میں زندہ بھی ہوں

زخم کو دِل کا ہی حصہ کہے جاؤں ناصح
یہ قرینہ بھی نہیں اور میں زندہ بھی ہوں

زندگانی نے کئی صدیوں کو لادا ہوا ہے
بوجھ اُٹھتا بھی نہیں اور میں زندہ بھی ہوں

وہ مری جان کہ تھی جس سے مری جان میں جاں
اب تو میرا بھی نہیں اور میں زندہ بھی ہوں





جونک جیسی محبت تو ہے آخری سانس تک
غمِ ہجراں کی عدت تو ہے آخری سانس تک

یہ الگ بات، جینے کی توفیق مل نہ سکے
زندگی کی ضمانت تو ہے آخری سانس تک

کوئی اپنے کٹہرے میں کب تک رہے گا کھڑا
آئینے کی عدالت تو ہے آخری سانس تک

سب کی ناوک نگاہی کو للکارتی ہے یونہی
مسکرانے کی عادت تو ہے آخری سانس تک

کسی ٹیٹو کی صورت ہے کندہ مری روح میں
ایک بے درد ساعت تو ہے آخری سانس تک

ایک انجانی زنجیر اڑنے نہیں دے رہی
اور ایسی سہولت تو ہے آخری سانس تک

کوئی کھائی ہے، میں جس میں گرتا چلا جاتا ہوں
ایک بے انت ظلمت تو ہے آخری سانس تک

زہر ہے یا ہے امرت خود آگاہی تقدیر ہے
جیسی بھی ہے یہ لذت تو ہے آخری سانس تک

سنتے سنتے زمانہ ہی اُکتا نہ جائے ظفرؔ
تیری میری حکایت تو ہے آخری سانس تک





نوید ظفر کیانی

کی شاعری کی کتابیں

- جہانِ دگر
- ۔۔۔اور بارش ہو
- میں اور چراغ
- تخلیئے کے رنگ
- رنگ و بُو کے چھینٹے
- ڈنکے کی چوٹ
- ڈھول کا پول
- کھری کھری
- ارے!
- دگڑ دگڑ
- کچھ میٹھا ہو جائے
- قلم مستیاں
- فرازیالوجی
- سخن کی خارش
- ایسی کی تیسی
- بول میری مچھلی ۔۔۔ (زیر طبع)
- شاعری سموسے والی (زیر طبع)
- لائقِ سنسر (زیر طبع)

مکتبۂ ارمغانِ ابتسام

https://archive.org/details/@nzkiani

nzkiani@gmail.com